بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# حجیّت حدیث

جناب مولانا محمد سعد صدیقی صاحب

الحمد للّٰہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوۃ والسلام

علیٰ رسولہ محمد وآلہٖ واصحابہ اجمعین۔

اما بعد، فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ صدق اللہ العظیم۔

قانون اسلامی کا دوسرا بڑا ماخذ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جسے عموماً علماء اصول فقہ سنت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم حجیت حدیث پر کچھ کلام کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کو ذہن نشین کر لیا جائے۔

حدیث کا مادہ ح د ث ہے عین کلمہ یعنی د کے فتح (زبر) کے ساتھ ہے۔ اس کا مضارع یحدث، عین کلمہ کے ضمہ (پیش) کے ساتھ آتا ہے۔

مادۂ حدیث یعنی حدث کا لغوی مفہوم بیان کرتے ہوئے ابن منظور لکھتے ہیں:

حدث: الحدیث نقیض القدیم والحدوث نقیض القدمۃ[1]

(حدث، حدیث قدیم کی اور حدوث قدامت کی ضد ہے۔)

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، قاہرہ دار المعارف، جلد ۲، صفحہ ۷۹۶۔

اس دعویٰ کی دلیل دیتے ہوئے ابن منظور نے نبی کریم کی ایک حدیث پیش کرتے ہیں:

کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة ۔[1]

ترجمہ: (ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے)

الیاس الظون لے حدث کا مفہوم دُدِعَ یعنی بیان کرنا لکھا ہے[2]

گویا اگر حدث کو مجرد سے نکال کر باب تفعیل میں لے جایا جائے اور حدث بنایا جائے تو اس کے معنی بیان و گفتگو ہوگا۔

حدیث کے اصطلاحی مفہوم کے ضمن میں ہم محدثین کے علاوہ اصولیین کے قول بھی نقل کریں گے تاکہ واضح ہو جائے کہ اصطلاح شریعت میں حدیث کی تعریف کیا ہے اور اس کے مشمولات کیا کیا ہیں)۔

نورالدین عتر لکھتے ہیں۔

ما اضیف الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من قول او فعل او تقریر او وصف خُلقی او خِلقی۔[3]

ہر وہ قول، فعل تقریر، عادت اور سیرت جو نبی کریم سے منسوب ہو، حدیث ہے)

حدیث کی اس تعریف پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ حدیث میں مندرجہ ذیل امور داخل ہیں۔

(۱) آپ کے تمام اقوال۔

(۲) آپ کے تمام افعال۔

(۳) صحابہ کرام کا وہ قول یا فعل، جس کو آپ نے علم ہونے کے باوجود منع نہیں فرمایا۔

(۴) آپ کی عادات۔

---

[1] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ: ملتان: ج ۱: ص ۲۴۳: (باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)۔

[2] الیاس، الظون الیاس، قاموس الیاس العصری، بیروت: ۱۹۷۲: ص ۱۳۸۰

[3] عتر، نورالدین: الدکتور (منہج النقد فی علوم الحدیث) دمشق: دار الفکر: ۱۹۸۱: ص ۲۶

(۵) آپ کی تخلیقی صفات۔

حدیث کی اس تعریف میں آپ کی وہ صفات بھی داخل ہوگئیں جو فطری اور پیدائشی طور پر بارگاہ الٰہی کی جانب سے، آپ کو ودیعت کی گئیں اور ان کو حاصل و اختیار کرنے میں آپ کے کسب و اختیار کو دخل نہیں۔

"شرح نخبۃ الفکر" میں ملا علی قاری نے حدیث کی تعریف یوں کی ہے۔

وفی اصطلاحھم قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفعلہ وتقریرہٗ وصفتہٗ حتی فی الحرکات والسکنات فی الیقظۃ والمنام۔ [1]

اس تعریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیداری کے افعال و اقوال کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رویا اور خواب بھی حدیث میں داخل ہو گئے۔

علماء اصولیین متفقہ طور پر حدیث کو قانون اسلامی کا دوسرا بڑا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ اور عموماً اس کو بجائے حدیث کے سنت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

چنانچہ آمدی لکھتے ہیں:

واما فی الشرع فقد تطلق علیٰ ما کان من العبادات نافلۃ منقولۃً عن النبی علیہ السلام، وقد تطلق علیٰ صدرہ عن الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الادلۃ الشرعیۃ بما ھو لیس بمتلو ولا ھو بمعجز ولا داخل فی المعجز ویدخل فی ذالک اقوال النبی علیہ السلام وافعالہ وتقاریرہٗ۔ [2]

ترجمہ۔ شرع اسلام میں سنت کے لفظ کا اطلاق ان تمام امور پر ہوگا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں اسی طرح ان دلائل پر بھی ہوگا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً یا عملاً ثابت ہوئے لیکن وہ قرآنی حصے نہیں ہیں اس طرح لفظ سنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] القاری، علی بن سلطان، الھروی، شرح نخبۃ الفکر کوئٹہ، ۱۹۷۳ء: ص ۱۶

[2] آمدی، سیف الدین ابی الحسن، "الاحکام فی اصول الاحکام" بیروت ۱۹۸۰ء، ج ۱ ص ۲۴۱

کے تمام اقوال، افعال اور تقریرات شامل ہوں گی۔ گویا اصولیین کے نزدیک آپ کے اقوال، افعال اور تقریرات تو حدیث میں داخل ہی ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ فطری صفات جن کو علماء سیر بیان کرتے ہیں اور جن کو نورالدین عتر نے حدیث کی تعریف میں داخل کیا ہے کبھی حدیث میں داخل ہیں علامہ خضری بک نے حدیث کی تعریف کرنے کے بعد ایک لفظ کا اور اضافہ کیا۔

و یطلق فی مقابلۃ البدعۃ۔ [1]

(سنت کے مقابلہ میں لفظ بدعت بولا جاتا ہے)

یعنی ہر وہ چیز جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل، تقریر سے ثابت نہیں، اس کو دین میں داخل کرنا اس کو دین کا جزو سمجھنا بدعت ہے۔ اور بدعت کے متعلق حدیث کا فیصلہ ہم گذشتہ اوراق میں نقل کر چکے ہیں۔

یہ حدیث کے لغوی اور اصطلاحی معنی اور مشمولات تھے اب ہم انشاء اللہ العزیز آئندہ اوراق میں منکرین حدیث کے حدیث پر کئے گئے اعتراضات اور شبہات کا تفصیل سے جائزہ لیں گے اور پھر قرآن وسنت کی روشنی میں ان کا جواب دیں گے۔

منکرین حدیث کی جانب سے اعتراض ۱

قرآن کا مجموعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریری صورت میں امت کے حوالہ کیا اگر حدیث بھی دین کا حصہ ہے تو اس کا کوئی مجموعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ خود مرتب کرایا نہ کسی اور کو ایسا کرنے دیا۔ نہ کسی کو کوئی حدیث حفظ کرائی۔ نہ کسی کی حفظ کردہ حدیث سنی نہ اس کی تصدیق فرمائی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت امت کے پاس کوئی مستند مجموعۂ احادیث موجود تھا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب کیا نہ صحابہؓ نے خود مرتب کر کے اس کی تصدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرائی۔ [2]

اس اعتراض پر اگر تجزیاتی طور پر غور کیا جائے تو اس اعتراض کے کچھ اجزاء بنائے جا سکتے

---

[1] خضری بک، محمد، اصول الفقہ، بیروت، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۱۴

[2] مقام حدیث، (حصہ دوم) کراچی ۱۹۶۳ء، صفحہ ۳۴۱، ۳۴۲۔

ہیں؛

۱۔ نبی کریمؐ نے کوئی مجموعہ احادیث خود مرتب نہ کرایا۔

۲۔ کسی صحابی کو ایسا نہ کرنے دیا۔

۳۔ کسی صحابی کو قرآن کی طرح حدیث حفظ نہیں کرائی۔

۴۔ کسی صحابی سے حفظ کردہ حدیث نہیں سنی نہ اس کی توثیق کی۔

۵ نبی کریمؐ کی وفات کے وقت کوئی مستند مجموعہ نبی کریمؐ سے تصدیق شدہ موجود نہ تھا۔

تدوین وتاریخ حدیث کا ادنیٰ علم رکھنے والے بھی اعتراض کے ان اجزاء کو دیکھ کر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اعتراضات یا تو انتہائے جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہیں یا ضد و عناد پر مبنی ہیں؛

سب سے پہلے ہم اس اعتراض کا جواب اسی کے حصہ سابقہ سے دیتے ہیں۔اس میں یہ کہا گیا ہے؛

قرآن کو کتاب کی شکل میں محفوظ کیا اور الحمد سے والناس تک ایک ایک لفظ زبانی یاد بھی کرایا چنانچہ اپنی وفات سے قبل حجۃ الوداع میں لاکھوں مسلمانوں سے اس امر کا اقرار لیا کہ قرآن ان تک پہنچا دیا گیا اور ان کے اقرار کے بعد اس پر خود اللہ کو شاہد قرار دیا کہ میں نے یہ قرآن ان سب تک پہنچا دیا۔ [۱] کیونکہ حجۃ الوداع کی ساری کیفیت، خطبہ حجۃ الوداع کے تمام اجزاء اور متون حدیث ہی میں منقول ہیں اور یہ بات بھی حدیث ہی میں منقول ہے جس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

الا فليبلغ الشاهد الغائب فرب مبلغ اوعىٰ من سامع، تسألون عنى، ماذا انتم قائلون قالو انشهد انك قد اديت الامانة وبلغت الرسالة ونصحت۔

فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم باصبعه السابحة يرفعها الى السماء وينكبها الى الناس اللهم اشهد اللهم اشهد اللهم

---

(۹۰۸) مقام حدیث (حصہ دوم) کراچی ۱۹۶۳ء ص ۳۴۱ ، ۳۴۲

اشہد -

اس بات پر کہ میں نے دین کما حقہٗ امت تک پہنچا دیا، صحابہ کرامؓ سے اقرار لیا اور پھر خدا کو اس پر شاہد قرار دیا یہ تمام واقعات حدیث ہی میں منقول ہیں -

· آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو کس طرح صحت مان لیا اور یہ بات کیسے تسلیم کر لی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے قرآن کو پہنچانے کا اقرار لیا - ؟

رہا اشکال کا پہلا جز وکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مجموعہ احادیث تیار نہیں کروایا -

· نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کا ایک مجموعہ نہیں بلکہ گیارہ ہزار مجموعہائے احادیث اس امت کے لیے چھوڑے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی تعداد حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ تھی جن میں سے گیارہ ہزار صحابہ کرام نے آپ کے اقوال وافعال کو حفظ یاد کر کے دوسروں تک پہنچایا - ان حضرات صحابہ میں ایسے صحابہ بھی تھے جنہوں نے صرف ایک یا دو روایات نقل کیں جن کو مقلین کہا گیا، ایسے بھی تھے جنہوں نے ہزاروں روایتیں نقل کیں، ان کو مکثرین کہا گیا اور ان کے درمیان کی تعداد میں روایت کرنے والے صحابہ کرام کو متوسطین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے - گیارہ ہزار صحابہ میں سے صرف ۲۰ یا ۲۵ ایسے صحابہ کرام مکثرین میں شمار ہوتے تھے جن کی روایات ہزار سے متجاوز تھیں اور چند ایک ایسے صحابہ تھے جن کی روایات سو اور ہزار کے درمیان تھیں وہ متوسطین تھے اور صحابہ کی اکثریت مقلین کی تھی - مکثرین میں سے ایک حضرت ابوہریرہؓ ہیں جن کی روایات کی تعداد ۵۳۷۴ ہے - حضرت عائشہؓ سے ۲۲۱۰ روایتیں منقول ہیں[1] ابوہریرہؓ کی روایات کے مجموعہ کی ضخامت کا اندازہ لگایا جائے تو وہ ضخامت قرآن کریم سے کم ہوگی تو جب آج کے دور میں قرآن کریم حفظ ہو سکتا ہے تو کیا احادیث حفظ نہیں ہو سکتیں - ان صحابہ کرام میں جو حفظ حدیث سے خصوصی

---

[1] عثمانی، محمد رفیع، مولانا، کتابت حدیث عہد رسالت وعہد صحابہ میں، کراچی، ۱۹۸۰ء، صفحہ ۲۴، ۲۵

شغف رکھتے تھے اور خصوصاً وہ صحابہ جو مکثرین کی تعریف میں آتے ہیں، ان میں پھر کچھ صحابہ ایسے صحابہ تھے جو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک چبوترے پر بیٹھتے تھے اور ان کا اس کے سوا کوئی کام نہ تھا کہ حدیثیں یاد کریں ایک دوسرے کو سنائیں اور ان کو دوسروں تک پہنچائیں۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سیرت وتاریخ میں اصحاب صفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اصحاب صفہ علم اور حصول علم میں اس قدر مستغرق تھے کہ دنیا وما فیہا سے مستغنی اور بے نیاز ہو چکے تھے۔ حافظ ابی نعیم ان کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

لم یحزنوا علیٰ ما فاتہم من الدنیا ولا یفرحوا الا بما ایدوا بہ من العقبیٰ۔ [1]

یہ اصحاب صفہ دنیا کی کسی چیز کے فوت ہو جانے پر کبھی غمگین نہ ہوتے اور ہمیشہ صرف اسی بات سے خوش ہوتے جو ان کے لیے آخرت کا حصہ بنتی۔

انہی اصحاب صفہ کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔

الحمد للہ الذی جعل فی امتی من امرت ان اصبر نفسی معہم۔

(خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ جن کے درمیان رہنے کا مجھے حکم دیا گیا ہے)

اصحاب صفہ کی تعداد مختلف زمانوں میں مختلف رہی صاحب حلیہ نے ۹۰ کے اسمار گرامی ذکر کیے ہیں۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے ۳۶ نام ذکر کیے ہیں [2]

ان اصحاب صفہ میں زیادہ تر حفظ حدیث کیا کرتے تھے جب کہ بعض ان میں سے اور بعض دیگر صحابہ کرام حدیث کی کتابت بھی کیا کرتے تھے۔

---

[1] حافظ ابی نعیم، احمد بن عبداللہ حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، بیروت ۱۹۸۰ء ج ۱ ص ۳۳۸
[2] کاندھلوی، محمد ادریس مولانا، سیرت المصطفیٰ، لاہور ۱۹۷۹ ج ۱: ص ۳۷۰-۳۸۱

اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کتابت حدیث کا حکم نہیں دیا لیکن صحابہ کرامؓ از خود حدیث کے لکھنے، اسے یاد کرنے اور صحیح الفاظ کے ساتھ یاد رکھنے کا اہتمام رکھا کرتے تھے اب ہم ان مجموعات کا جائزہ لیتے ہیں جو صحابہ کرامؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں تیار کر لیے تھے۔ ان میں وہ تحریریں اور مجموعات زیر بحث آئیں گے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کتابت کرائے اور وہ بھی جن کی تصدیق صحابہ کرامؓ نے نبی کریم سے حاصل کی۔

سب سے پہلے ہم ان تحریرات کا جائزہ لیں گے جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تحریر کی گئیں۔

**کتاب الصدقۃ** حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مستند و مشہور مجموعہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بڑے اہتمام کے ساتھ املاء کرایا، اس مجموعہ میں مویشیوں کی زکوٰۃ کی تفصیلات اور دیگر مسائل متعلقہ درج تھے۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمال کو بھیجنے کے لیے مرتب کروایا تھا، ابھی اس کے بھیجنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا۔

سنن ابی داؤد اور ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے۔

کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب الصدقۃ فلم یخرجہ الی عمالہ حتی قبض فقرنہ بسیفہ فلما قبض عمل بہ ابو بکرٍ حتی قبض ثم عمل بہ عمر حتی قبض فکان فیہ فی خمس من الابل شاۃ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الصدقہ لکھوائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنے عاملوں کے پاس بھیجنے نہ پائے تھے کہ آپ کی وفات ہوگئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی تلوار کے ساتھ لگا رکھا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس پر حضرت ابوبکرؓ نے عمل کیا، یہاں تک کہ وفات پائی، پھر اس پر عمرؓ نے عمل کیا

---

[1] عثمانی: محمد رفیع مولانا: کتابت حدیث: ص ۸۱

یہاں تک کہ وفات پائی اس میں لکھا تھا کہ "پانچ اونٹ پر ایک بکری واجب ہے۔

اس کتاب الصدقہ کی حجیت یوں اور زیادہ ثابت ہو جاتی ہے کہ اس پر مہر نبوت ثبت ہے اور اسے قرون اولیٰ میں متواتر درس گاہوں میں پڑھایا جاتا رہا ہے [۱]
ابو داؤد اور ترمذی میں اس کا مکمل متن موجود ہے یوں اس کی تدریس اور اس کو پڑھنے، پڑھانے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے کیونکہ ابو داؤد اور ترمذی حدیث کی وہ بنیادی کتب ہیں جو درسِ نظامی کے نصاب میں شامل ہیں اور تقریباً مکمل درساً درساً پڑھائی جاتی ہیں۔

## صحیفہ عمرو بن حزم

کتاب الصدقہ کے علاوہ ایک اور صحیفہ کا ثبوت ہمیں ملتا ہے کہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت ابی بن کعبؓ سے ایک کتاب کی صورت میں لکھوایا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۰ھ میں پیش آیا جب کہ نجران کا علاقہ فتح ہوا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کو وہاں کا گورنر متعین کیا اس وقت یہ صحیفہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود املا کرایا جس میں طہارت، نماز، زکوٰۃ، عشر، حج، عمرہ، جہاد، غنیمت اور جزیہ، کے احکام، نسلی قومیت کے نظریہ کی ممانعت، دیات، بالوں کی وضع، تعلیم قرآن اور طرز حکمران کے متعلق ہدایات درج تھیں [۲]
عمرو بن حزم نے نہ صرف اس صحیفہ کو محفوظ رکھا، بلکہ اس میں اکیس دوسرے نوشتے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عادو بنی عریض کے یہودیوں، تمیم داری، قبائل جہینہ وجذام، طی، ثقیف وغیرہ کے نام لکھوائے تھے، حاصل کیے، اور ان سب کی ایک کتاب تالیف کی جو عہد رسالت کی سیاسی و سرکاری دستاویزوں میں اولین مجموعہ کی حیثیت رکھتی ہے [۳]

---

[۱] عثمانی، م ر، کتابت حدیث، صفحہ ۸۰، ۸۱۔

[۲] " " " " " " " ۸۴، ۸۵۔

[۳] کاندھلوی، م ا، مولانا۔ سیرت المصطفیٰ، جلد ۲، صفحہ ۲۷۷ تا ۲۱۲۔

سیرۃ میں ہر خط کا متن اور اردو ترجمہ درج بالا صفحات پر موجود ہے۔ م س ص۔

ان دو بڑے اور دو قیع صحف کے علاوہ، نو مسلم وفود کے لیے صحف جیسے وائل بن حجر کے لیے آپ نے ان کی درخواست پر کہ اکتب لی الی قومی کتابا حضرت معاویہؓ کو حکم دیا تھا کہ ان قبائل کے لیے لکھ دو کہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔

مزید برآں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ خطوط جو صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہان عالم کو لکھے اور ان کو ان خطوط میں اسلام کی دعوت دی۔

مندرجہ ذیل شاہان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطوط روانہ کیے۔

۱۔ قیصر روم

۲۔ خسرو پرویز کسریٰ شاہِ ایران

۳۔ نجاشی شاہ حبشہ

۴۔ مقوقس شاہ مصر و اسکندریہ

۵۔ منذر بن ساویٰ شاہ بحرین

۶۔ شاہ عمان کے نام

۷۔ رئیس یمامہ ہوذۃ بن علی

۸۔ امیر دمشق حارث غسانی

یہ تقریباً آٹھ خطوط تھے اور بعض روایات میں ہے کہ نجاشی کو دو خطوط روانہ کیے اس طرح یہ کل ۹ ہو جائے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں جب اسلامی فتوحات کثرت سے ہونے لگیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف عمال، گورنر اور قاضی مقرر کرنے شروع کر دیے، ان عمال اور قاضیوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زبانی یا تحریری کچھ ایسی نصائح فرماتے تھے جو امور مملکت و قضا میں ہمیشہ ان کے کام آتی تھیں مثلاً حضرت علیؓ کی ایک روایت ابو داؤد اور ترمذی نے نقل کی جس کے الفاظ کچھ اس طرح ہیں۔

بعثنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الیمن قاضیاً فقلت یا رسول اللہ ترسلنی وانا حدیث السن لاعلم لی بالقضاء فقال ان اللہ عز وجل سیہدی ویثبت لسانك فاذا جلس بین یدیك الخصمان فلا تقضی حتی تسمع من الاٰخر کما سمعت من الاول فانہٗ احری ان یتبین لك القضا قال علی: فما زلت قاضیاً وما شککت فی قضا بعدہٗ [1]

ترجمہ: حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن کا قاضی بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کیا میں نے عرض کیا یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ابھی نوجوان ہوں اور قضا کے شعبہ میں زیادہ پختہ علم نہیں رکھتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کیسے قاضی بنا کر بھیج رہے ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اللہ تعالے تمہارے دل کو ہدایت اور تمہاری زبان کو استقامت دے گا، جب تیرے سامنے دو فریق آ کر بیٹھیں تو اس وقت تک فیصلہ نہ کرنا جب تک دوسرے فریق کا موقف بھی اس توجہ وانہماک سے نہ سن لے جیسا کہ تو نے پہلے فریق کا سنا۔ یہ چیز تجھے واضح فیصلہ کرنے میں مدد دے گی"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جب تک میں قاضی رہا مجھے اپنے فیصلہ میں تذبذب کا سامنا نہ ہوا۔

اسی طرح حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجنے لگے تو حضرت معاذؓ نے دریافت کرنے پر یہ عرض کیا کہ قرآن سے فیصلہ کروں گا اگر قرآن میں نہ ہوا تو سنت سے اور اگر سنت میں بھی نہ ہوا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس

---

[1] ابوداؤد: کتاب الاقضیہ باب کیف القضاء: بیروت، دار الفکر، جزو ثالث: ص ۳۰۱

ترمذی، کتاب الاحکام، باب ما جاء فی القاضی لا یقضی بین الخصمین حتی یسمع کلامہما۔ ج ۱، ص ۲۴۰۔ ج ۱، ص ۲۴۰۔ کراچی۔ ایم ایم سعید (ترمذی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

جواب کو سن کر مسرور ہوئے، معاذ کے سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا :

الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضیٰ رسول اللہ [1]

ترجمہ: (خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے نبی کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی کہ جس سے اللہ کا رسول خوش ہو۔

اسی طرح حکام، عمال، اور قضاۃ کو نبی کریم نے تحریری وثائق بھی عطا فرمائے جو امور قضاء میں ان کے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً

عبداللہ بن عماد بن اکبر بن ربنیعہ جو العلاء الحضرمی کے نام سے معروف ہیں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کا قاضی بنا کر بھیجنے کا فیصلہ فرمایا تو ان کو ایک طویل خط [2] عطا فرمایا جسے سب سے پہلے حارث بن اسامہ نے اپنی مسند میں ذکر کیا اس خط کا کچھ متن اقضیۃ الرسول میں بھی درج ہے۔ [3]

علاوہ ازیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام عہد نامے، جاگیروں کے ملکیت نامے، امان نامے، بیع نامے، وقف نامے، اور اس قسم کی دوسری دستاویزات بھی حدیث کے ان مجموعوں میں سے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود املا کرائیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان امالی کے علاوہ صحابہ کرام نے از خود بھی کچھ مجموعہائے حدیث تحریری شکل میں مدون کیے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے"

۱- صحیفہ علی بن طالب اس میں دیت، فدیہ، قصاص، ذمیوں کے حقوق، ولاء، و معاہدات درج تھے۔

۲- حضرت انس کی تالیفات: حضرت انس رض جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گھر کے ایک فرد کی طرح رہتے تھے حدیث کے متعدد مجموعے تیار کیے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھ کر سنائے۔

۳- صحیفہ عروۃ بن زبیر

۴- عبداللہ بن عباس کے صحیفے

---

[1] ابوداؤد، کتاب الاقضیۃ، باب فی اجتہاد الرای فی القضاء، صفحہ ۳۰۳۔

[2] المالکی، ابی عبداللہ بن فرج، اقضیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیروت، دار الکتب، ۱۹۸۲ء صفحہ ۲۸۔

[3] یہ خط نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذیقعدہ سنہ ۸ھ کو تحریر فرمایا۔

۵ - صحیفہ جابر بن عبداللہ

۶ - صحیفہ صادقہ۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے حدیث کا ایک مجموعہ تحریر کیا تھا جس کا نام "الصادقۃ" رکھا تھا۔

۷ - حضرت سعد بن عبادہؓ نے ایک مجموعہ حدیث تیار کیا تھا۔

۸ - حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔

۹ - حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عائشہؓ لوگوں کی فرمائش پر وقتاً فوقتاً حدیثیں لکھ کر بھیجتی رہتی تھیں۔

۱۰ - حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔[۱]

ان اشارات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کہنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حدیث کا تحریری شکل میں کوئی مستند مجموعہ نہ تھا تاریخ سے عدم واقفیت، اور ضد و عناد پر مبنی ہے۔ یہ تو چند صحف ہیں جو ہم نے ذکر کیے اگر کتب تاریخ میں تلاش کیے جائیں تو بیسوں اور بھی ایسے مجموعات کا انکشاف ہو سکتا ہے چند ایک کا ذکر صرف اعتراض کے جواب کے طور پر کر دیا۔

ان مجموعوں میں وہ مجموعہائے حدیث بھی آئے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود املاء کرائے اور مہر نبوت ثبت فرمائی اور ایسے مجموعات کا بھی ذکر آیا کہ جو صحابہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تلاوت کر کے اس کی تصدیق حاصل کی۔

مذکورہ بالا مجموعہائے حدیث میں اکثر ایسے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہی تیار ہو گئے تھے۔

مزید یہ کہ تحریر پر ہی حفاظت کا تمام دارومدار نہیں تھا اہل مکہ اور خصوصاً قریش اس قدر ذہین اور فطین واقع ہوئے تھے کہ پورا پورا دیوان ایک مرتبہ ہی سن کر حفظ کر لیتے تھے۔ عرب، خصوصاً قریش یاد رکھنے کے لیے لکھنے کو عیب اور کند ذہنی سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ شخص شاعر نہ ہوتا تھا جس کے سامنے پانچسو شعر پڑھے جائیں اور

---

[۱] عثمانی، ام ر، کتابت حدیث، ص۔

پھر پوچھا جائے کہ بتاؤ ان میں مدح کا شعر کونسا تھا اور وہ سناتے وقت کچھ سوچ و بچار سے کام لے۔ چند ایک چیزیں صحابہ کرام کے حافظہ کے متعلق پیش کی جاتی ہیں۔

کسی چیز کو یاد رکھنے کا تعلق دو چیزوں سے ہے۔ (۱) قوتِ حافظہ۔ (۲) تعلق و محبت ہم یہاں صرف قوتِ حافظہ کے بارے میں ایک دو چیزیں عرض کریں گے تعلق و محبت کا بیان آئندہ آئے گا حضرت ابوہریرہؓ کی ذہانت و ذکاوت کا ایک واقعہ تاریخ میں مشہور ہے جسے امام حاکم نے اپنی "مستدرک" میں بیان کیا ہے۔

"ایک مرتبہ مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کا امتحان لینا چاہا، اس نے ایک کاتب کو چھپا کر بٹھا دیا اور ابوہریرہ سے ایک خاص موضوع پر احادیث پوچھنا شروع کر دیں وہ بیان کرتے جاتے تھے اور کاتب درپردہ ان سے لکھتا جاتا تھا دوسرے سال پھر اس نے اسی طریقہ سے حدیثیں پوچھیں، اس دفعہ بھی انہوں نے بلاکم و کاست اسی طرح احادیث بیان کیں جس طرح پچھلے سال بیان کر چکے تھے، یہاں تک کہ ترتیب میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔" [۱]

یہی ذکاوت صحابہ سے تابعین اور پھر تبع تابعین میں منتقل ہوئی۔

امام بخاریؒ کی ذکاوت کا بھی ایک واقعہ مشہور ہے۔ یہ واقعہ حاشر بن اسمٰعیلؒ نے بیان کیا۔

"امام بخاریؒ میرے ہمراہ شیوخ کی خدمت میں آمد و رفت رکھتے تھے ہم لوگ شیخ کی بیان کی ہوئی احادیث لکھا کرتے تھے، مگر امام بخاریؒ کچھ نہ لکھتے تھے ہم لوگ ان پر اعتراض کرتے تھے کہ جب آپ لکھتے نہیں تو درس میں شرکت سے کیا فائدہ، پندرہ یا سولہ روز کے بعد امام بخاری نے کہا تم لوگوں نے مجھے تنگ کر دیا اچھا آج میری یادداشت سے اپنے نوشتوں کا مقابلہ کرو، حاشر کہتے ہیں ہم نے اس وقت پندرہ ہزار حدیثیں لکھ لیں تھیں بخاری نے وہ

---

[۱] طالب الہاشمی، سرورِ کائنات کے پچاس صحابہ، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۶۹۔

سب اپنی یاد سے سنا دیں جس سے ہم کو حیرت ہوئی"[1]

یہ اس ذہانت کی دو جھلکیاں ہیں جو اس وقت کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو علم حدیث کی خدمت کی بدولت عطا کی تھیں۔ تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے یہاں مزید تفصیلات عرض کرنے کی گنجائش نہیں۔ اسی پر اکتفا کر کے حجیت حدیث پر کچھ قرآنی آیات سے استدلالات پیش کرتا ہوں

## حجیت حدیث پر دلائل از قرآن

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جا بجا ایمان باللہ کے حکم کے ساتھ ایمان بالرسول کا بھی حکم دیا۔ مثلاً۔

فآمنوا باللہ ورسلہ وان تؤمنوا وتتقوا فلکم اجر۔[2]

ترجمہ: ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اگر تم ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لیے بدلہ ہے)

یاایھا الذین آمنوا آمنوا باللہ ورسولہ۔[3]

ترجمہ: (اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول پہ اپنا ایمان قائم رکھو)

قد جاءکم الرسول بالحق من ربکم فآمنوا خیراً لکم۔[4]

ترجمہ: (تمہارے پاس آیا اللہ کا رسول حق کے ساتھ تمہارے رب کی جانب سے پس تم اس پر ایمان لاؤ یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا)

---

[1] بجنوری، احمد رضا خاں، مقدمہ انوار الباری شرح اردو صحیح البخاری، گوجرانوالہ، ۱۹۸۱ حصہ دوم، ص۔ ۱۷۰۔

[2] ۳: آلِ عمران: ۱۷۹۔

[3] ۴۔ النساء۔ ۱۳۶

[4] ۴۔ النساء۔ ۱۷۰۔

فامنوا باللہ ورسولہ ولا تقولوا ثلثۃ۔[1]

ترجمہ: (اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور خدا کو تین نہ قرار دو)

فامنوا باللہ ورسولہ النبی الامی الذی یومن باللہ۔[2]

ترجمہ: (ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے نبی امی پر جو خود بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں)

ایمان کے معنیٰ علمائے اہل سنت نے ان الفاظ کے ساتھ بیان کیے۔

وھو التصدیق بما علم مجئ الرسول بہ ضرورۃ اجمالا فیما علم اجمالا وتفصیلاً فیما علم تفصیلاً۔[3]

ترجمہ: (جن چیزوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لانے کا واضح طور پر علم ہو جائے تو اجمالی چیزوں کی اجمالاً اور تفصیل چیزوں کی تفصیل کے ساتھ تصدیق کرنے کو ایمان کہتے ہیں)۔

گویا ایمان کی بنیاد اسی بات پہ ہے کہ انسان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول، فعل اور تقریر کی تصدیق کرے۔

ان کا انکار ایمان کے خلاف ہے اور انسان کو ایمان کی حدود سے نکالنے والا ہوگا۔ قرآن کریم اہل ایمان انہی لوگوں کو تصور کرتا ہے کہ جو اللہ کے ساتھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان رکھتے ہوں ارشاد ہوا۔

انما المؤمنون الذین امنوا باللہ ورسولہ واذا کانوا معہ علیٰ امر جامع لم یذھبوا حتی یستاذنوہ۔[4]

ترجمہ: (بلاشبہ مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

[1] ۴۔ النساء: ۱۷۱۔

[2] ۷۔ الاعراف۔ ۱۵۸۔

[3] عثمانی، شبیر احمد، علامہ۔ فضل الباری شرح اردو صحیح بخاری، کراچی ۱۹۷۳ء، ج ۱ ص۔

[4] ۲۴۔ الروم: ۶۲۔

کے پاس کسی ایسے کام پر ہوتے ہیں جس کے لیے مجمع کیا گیا ہے تو ضرورت پڑنے پر جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہیں لے لیتے جاتے نہیں)

ایمان کا مفہوم گذر چکا کہ ایمان محض اس چیز کو مان لینے کا نام نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں بلکہ ایمان کی بنیاد ان تمام باتوں کی تصدیق ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہم تک پہنچیں خواہ وحی متلو کی شکل میں خواہ وحی غیر متلو کی شکل میں۔ ان تمام چیزوں کی تصدیق اور ان کو حجت ماننا ایمان ہے اس بات کو اگر فلسفیانہ نظر سے دیکھیں تو یہ کہا جائے گا کہ یہ موجبہ کلیہ ہے یعنی تمام چیزوں کے ماننے کا نام ہے اور اس کی نقیض اور ضد سالبہ جزئیہ ہوتی ہے یعنی کسی ایک چیز کا انکار بھی کفر ہو گا اور اگر کوئی مجیبات من رسول میں سے ایک حصہ پر تو ایمان رکھتا ہے اور دوسرے کی حجیت کو تسلیم نہیں کرتا اس کا ایمان نامکمل ہے۔

قرآن کریم نے انبیا سابقین اور مومنین کے ایمان کی حقیقت بیان فرماتے ہوئے فرمایا:

'امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون، کل آمن باللہ وملئکۃ وکتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ۔ [۱]

ترجمہ: (ایمان رکھتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور مومنین بھی سب کے سب ایمان رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اس کے فرشتوں کے ساتھ اس کی کتابوں کے ساتھ، اس کے پیغمبروں کے ساتھ کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے)

غرضیکہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ذکر کیا ہے۔

مولینا سید بدر عالم صاحب لکھتے ہیں:

"در حقیقت یہاں مولانا اسلم کو ایک شدید غلطی ایمان کے معنی سمجھنے میں پیش آگئی

---

[۱] ۲۔البقرۃ۔۲۸۵:

اگر وہ ایمان کی صحیح حقیقت کو معلوم کر لیتے تو اطاعت کو ایمان سے علیحدہ کر ہی نہیں سکتے تھے، وہ یہ سمجھے ہیں کہ ایمان صرف زبان سے تصدیق کر لینے کا نام ہے، اس لیے ان کے نزدیک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق صرف تصدیق کر کے ادا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اطاعت کی ضرورت نہیں رہتی۔ حالانکہ اگر وہ ذرا تحقیق کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اولاً تو اطاعت کے بغیر ایمان ہی حاصل نہیں ہو سکتا، دوم قلبی تصدیق حاصل ہو جانے کے بعد یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اطاعت کا عہد دل میں نہ پیدا ہو جائے جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا عہد نہیں کرتا، یقیناً وہ دل میں اس کی تصدیق بھی نہیں رکھتا۔ اسی بناء پر ہرقل بادشاہ کو مسلمان نہیں کہا گیا۔ حالانکہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلی محفل میں تصدیق کر لی تھی اگرچہ اپنی قوم کی برہمی دیکھ کر بعد میں بات بنا دی تھی، اسی طرح ابوطالب کی تصدیق بھی ان کے اشعار سے ثابت ہوتی ہے اس کے باوجود جمہور امت نے ان کا ایمان تسلیم نہیں کیا اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے ہزار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی ہو لیکن جب ان کے دل نے معمولی انسانوں سے عار کی خاطر رسول عربی کی اطاعت کرنا قبول نہیں کیا تو ان کو مسلمان کیسے کہہ دیا جائے۔[۱]

**دلیل ۲:** قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

والنجم اذا ھوٰی ما ضل صاحبکم وما غویٰ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ[۲]

ترجمہ: (قسم ہے (مطلق) ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے، یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے نہ راہِ (حق) سے بھٹکے نہ غلط راستہ پر ہو لیے اور نہ آپ اپنی خواہش

---

[۱] مدنی، محمد بدر عالم: سنت حجیت حدیث، لاہور ۱۹۷۹ء، ص ۶۱۔

[۲] النجم: ۱ تا ۴

نفسانی سے بات بناتے ہیں آپ کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔
اس آیت مبارکہ کو نقل کرنے کے بعد مولانا محمد ادریس کاندھلوی فرماتے ہیں۔

"یعنی جسطرح ستارہ اپنی ایک معین رفتار پر چلتا ہے ذرہ برابر ادھر یا اُدھر نہیں ہو پاتا اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آسمان نبوت و رسالت کے ایک ستارے ہیں جو راہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر فرما دی ہے اس سے ذرہ برابر آگے پیچھے نہیں ہوتے۔ اور جس طرح ظاہری ستاروں کا نظام محکم ہے اسی طرح بلکہ زائد باطنی اور روحانی ستاروں کا نظام محکم ہے" [۱]

دلیل ۳:۔ قرآنی آیات و تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انبیاء کا درجہ ملائکہ سے بڑھ کر اور ان سے افضل تر ہے۔ جبکہ ملائکہ کے بارے میں یوں فرمایا گیا۔

لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یومرون۔

وما یعلم جنود ربک الا ھو

اس فضیلت و برتری کے باوجود زمین میں خلافت کے لیے بنی آدم کو چنا اور ملائکہ کی تسبیح و تحمید اور عصمت کے باوجود آدم کو ان کے علم کی بناء پر فضیلت دی اور ملائکہ کو حکم دیا اسجدوا لآدم۔ (آدم کو سجدہ کرو) اور یہ بات بدیہی ہے کہ ہمیشہ جس چیز کو مسجود بنایا جاتا ہے، وہ سجدہ کرنے والوں سے افضل ہوتی ہے۔ اور پھر ابلیس کو اس سجدے سے انکار پر فرمایا۔

علیک لعنتی الی یوم الدین

انبیاء کی اس فضیلت کو مولانا کاندھلوی یوں بیان فرماتے ہیں۔

---

[۱] حجیت حدیث، مولانا کاندھلوی

اہل سنت والجماعت کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام ملائکہ سے افضل ہیں:

کما قال تعالیٰ ان اللہ اصطفیٰ اٰدم و نوحًا و اٰل ابراھیم
و اٰل عمران علی العالمین [۱]

ترجمہ: تحقیق اللہ تعالیٰ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہانوں پر فضیلت دی۔"

آگے چل کر مولانا و تلك حجتنا ... الیٰ و لوطًا نقل کر کے فرماتے ہیں۔

"حق تعالیٰ شانہٗ نے ان آیات میں انبیاء کرام کا نام بنام تذکرہ فرمایا اور اس کے بعد فرماتے ہیں وکلا فضلنا علی العالمین۔ [۲] اور ہر ایک کو ہم نے تمام جہانوں پر فضیلت دی۔ اور عالمین میں فرشتے بھی داخل ہیں"۔

معلوم ہوا کہ انبیاء فرشتوں سے افضل ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ جب انبیاء کرام کے کلام اور وحی و الہام کے حجت ہونے میں شیطان کو بھی شبہ اور تردد نہیں تو انبیاء کرام کے قول و فعل کے حجت اور واجب العمل ہونے میں بھی کوئی شبہ اور تردد نہ ہونا چاہیئے [۳]

دلیل ۴: وما کان لمؤمنٍ و لا مؤمنةٍ اذا قضی اللہ و رسولہٗ امرًا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم و من یعص اللہ و رسولہٗ فقد ضل ضلالًا مبینًا [۴]

ترجمہ: کسی مسلمان مرد و عورت کو یہ اختیار نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول نے اس کے کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ کیا ہو (اور پھر) ان کو اپنے کام کا اختیار ہو جس نے اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کی

---

[۱] ۳۔ آلِ عمران ۳۳۔

[۲] ۶۔ الانعام۔ ۸۶۔

[۳] کاندھلوی: م۔ا۔ حجیت حدیث، ص۔ ۳۰ تا ۳۲۔

[۴] ۳۳۔ الاحزاب۔ ۳۶۔

وہ بلاشبہ مکمل گمراہ ہوا)

اس آیت کی تشریح کے ضمن میں حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

"فھٰذہٖ الآیۃ عامّۃ فی جمیع الامور، وذالک انہ اذا حکم اللہ ورسولہٗ بشیٍٔ فلیس لاحدٍ مخالفتہ ولا اختیار لاحدٍ ھٰھنا ولا رائی ولا قول"۔ [1]

ترجمہ: (پس یہ آیت تمام امور پر حاوی ہے، اس طرح کہ جب اللہ اور اس کے رسول جب کسی معاملہ میں اس کا فیصلہ کریں تو کسی کو بھی اس کی مخالفت کی گنجائش نہیں اور نہ کسی رائے اور قول کے اختیار کی)۔

یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ کسی بھی مومن مرد وعورت کے لیے اس قدر اٹل ہے کہ اس کے نفاذ کے بغیر اس کے لیے کوئی اور راستہ نہیں رہ جاتا سوائے اس کے کہ وہ اس پر بلا چون وچرا عمل کرے مولانا کاندھلوی فرماتے ہیں۔

ولا یخفیٰ ان ھٰذہٖ الآیۃ الکریمۃ مشتملۃ علیٰ ذکر قضائین- قضا اللہ وقضاء رسولہٖ فدلّ ذلک ان قضا الرسول حجۃ مستقلۃ سوٰی قضاء اللہ عز وجلّ - فلوکان قضاءُ اللہ وحکمۃٗ کافیًا لم یکن لذکر قضاء الرسول بعدہٗ معنیً۔ [2]

ترجمہ: (یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ آیت کریمہ دو قسم کے فیصلوں پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے، اس سے معلوم ہوا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بھی بذاتِ خود حجت ہے جو اللہ کے فیصلے کے علاوہ ہو، اور اگر صرف اللہ کا فیصلہ اور اس کا حکم کافی ہوتا تو اس کے ذکر کے بعد علیحدہ نبی کے فیصلہ کے ذکر کی ضرورت نہ تھی)

اور پھر صرف یہی نہیں کہ وہ یہ فیصلہ قبول کریں بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اس فیصلہ کو زبردستی

---

[1] ابن کثیر، اسمٰعیل القرشی: تفسیر القرآن العظیم: لاہور ١٩٧٣ء: ج ٣: ص ٤٩٠

[2] کاندھلوی، محمد ادریس، مولانا مقدمۃ الحدیث، بحث حجیت حدیث (غیر مطبوعہ)

طوعاً وکرہاً اپنی طبیعت پر جبر واکراہ کرتے ہوئے قبول نہ کریں بلکہ مکمل خوشی اور یکسوئی کے ساتھ اسے قبول کریں اور ایسے لوگوں کے ایمان سے خارج ہونے کو خدا نے اپنی ربوبیت کی قسم کھا کر کہا جو نبی کریم کے فیصلہ کو قبول کرنے میں اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس کریں فرمایا: فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً[۱]

ترجمہ (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے رب کی قسم ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں یہاں تک کہ اپنے معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر دل میں تنگی محسوس نہ کریں اور اس کو بخوشی قبول کریں)

یعنی اپنے تمام امورِ زندگی میں جب تک وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو فرحتِ طبع کے ساتھ قبول نہ کریں دائرہ ایمان میں داخل نہ ہوسکیں گے۔ حدیث میں آیا۔

"والذی نفسی بیدہ لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ"[۲]

ترجمہ: اس ذاتِ عالی کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک اس کی تمام خواہشات تابع نہ ہوجائیں ان احکام کے جن کو میں لے کر آیا ہوں)

دلیل ۵:۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃٌ حسنۃٌ۔[۳]

ترجمہ: تحقیق تمہارے لیے رسول کی ذات میں عمدہ نمونہ ہے)

امام راغب مفردات میں اسوۃ کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"وھی الحالۃ التی یکون الانسان علیھا فی اتباع غیرہ ان حسناً وان قبیحاً"[۴]

ترجمہ: اسوۃ انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے کی اتباع اور پیروی میں وہ اختیار کرے خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری)

یعنی لفظ اسوۃ میں خود اتباع کا مفہوم پایا جاتا ہے پھر حسنۃ کی صفت کے بعد مزید اس میں

---

[۱] ۴۔النساء۔۶۵۔

[۲] مرقاۃ: شرح مشکوٰۃ: ج ۱، ص: ۳۳، (باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

[۳] ۳۳۔الاحزاب:۲۱

[۴] الاصفہانی: ابوالقاسم الحسن بن محمد بن المفضل: مفرداتِ الفاظ القرآن،

تاکید پیدا کر دی گئی کہ اسوہ بذاتِ خود قابلِ اتباع اور پیروی کے لائق چیز ہے مزید یہ کہ وہ اگر اچھا بھی ہو، خدا کی نظر میں تو اس کا اتباع عقلاً مزید واجب ہو جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اسی معنی میں امت کے لیے اسوہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر اللہ کے اتباع اور پیروی میں انسان کی جو حالت وکیفیت ہوتی ہے، اس کا مشاہدہ کرنا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کرو اور پھر اس کا اتباع اور پیروی کرو تو گویا تم اللہ کی اطاعت اور پیروی کرنے والے ہو جاؤ گے۔ اردو میں اسوۃ کا ترجمہ نمونہ سے کیا جاتا ہے یعنی اگر تمہیں خدا کی اطاعت و پیروی کا عملی، زندہ اور مکمل نمونہ دیکھنا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دیکھ لو ان کی زندگی اللہ کی اطاعت و پیروی کی ایک واضح اور مکمل تصویر ہے

مولینا کاندھلوی ؒ لکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کو فقط اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ فقط بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچا کر اپنی منصبی خدمات سے فارغ ہو جائیں بلکہ وہ من جانب اللہ امت کے لیے معلم، ہادی، مصلح اور مربی بلکہ اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ تاکہ ان کا ہر قول ہر فعل، ہر بیان وسکوت امت کے لیے حجت اور مشعل ہدایت ہو اور اللہ کے بندوں کو معلوم ہو جائے کہ خدا کی اطاعت اس طرح کرو جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھتے ہو، [۱]

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

ھذہ الآیۃ الکریمۃ اصل کبیر فی التاسی برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اقوالہ، وافعالہ، واحوالہ ولھذا امر تبارک وتعالیٰ بالتاسی بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاحزاب فی صبرہ و مصابرتہ۔ [۲]

(یہ آیت کریمہ ایک بڑی اصل ہے نبی کریم کے اقوال، افعال اور احوال کی اتباع

---

[۱] کاندھلوی: م ا: حجیت حدیث: ۳۳: ۳۴

[۲] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ۳، ص ۴۷۴

میں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے احزاب کے دن مسلمانوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر و استقامت کی اتباع کا حکم دیا)۔

یعنی اگرچہ آیت کا شانِ نزول ایک خاص محل اور واقعہ ہے لیکن یہ حکم محض اس واقعہ کے ساتھ خاص نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس واقعہ میں قابلِ پیروی ہے باقی احوال میں نہیں بلکہ حکم عام ہے زندگی کے ہر شعبہ و مرحلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا اتباع از روئے آیت ہمارے لیے ازبس ضروری ہے۔

دوسری قابلِ غور بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو قابلِ تقلید نمونہ بنایا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے احکام تو پوری جامعیت کے ساتھ قرآن کریم میں بیان ہو گئے اب ان کی عملی تصویر اور عملی شکل کو واضح کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ بنا دیا گیا اس لحاظ سے قابلِ غور بات یہ ہو گی کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ بھی اسی قدر جامع ہے جس قدر قرآنی احکام یا نہیں؟ اگر ہمارا جواب نفی میں ہو تو پھر مکمل قرآن پر عمل کس طرح ہو گا؟ اور یہ بات پھر خدا پر ایک الزام کے درجہ میں آجائے گی اور اس کے علام الغیوب میں ہونے میں شک و تردد ہونے لگے گا کہ اس نے اپنی کتاب اور اپنے احکام پر عمل کیلئے جو نمونہ بھیجا وہ مکمل نہ تھا۔ اور پھر خدا کی صفات قدرت و علم پر لوگ شبہ کی نگاہ ڈالنے لگیں گے

بالفاظ دیگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کی جمعیت جس کو قرآن نے اسوہ کہا سے انکار خدا کے علّام اور قادرِ مطلق ہونے میں شبہ پر مبنی ہے۔ اور جو شخص خدا کی کسی صفت میں بھی انکار یا شک تردد کا اظہار کرتا ہے وہ دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے کیونکہ ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ کی تمام صفات پر یقین کامل ہو اور ایمان کامل کی نشانی یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کی صفات پر ایسا ایمان ہو کہ گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔

ارشاد ہوا:

ان تعبد اللہ کانک تراہ۔ [1]

---

[1] بخاری، کتاب الایمان۔

ترجمہ: (عبادت کی معراج یہ ہے کہ تو اس طرح عبادت کرے کہ گویا تو خدا کو دیکھ رہا ہو۔)
اور یہ بات یقین کامل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

اور اگر ہمارا جواب اثبات میں ہو اور ہم اسوہ رسول کو جامع مان لیں تو پھر ہمیں اس کی حجیت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کے بغیر قران پر عمل تو در کنار، اس کا سمجھنا بھی مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔

صحیح بخاری میں کتاب الصلوٰۃ کے شروع میں ایک طویل حدیث نقل کی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ واقعہ معراج میں پنجگانہ نماز کی فرضیت کے بعد حضرت جبرئیل آئے اور دو دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازیں پڑھوائیں، پہلے دن تمام نمازیں شروع وقت میں اور دوسرے دن تمام نمازیں اخیر وقت میں پڑھوائیں اور اس کے بعد فرمایا۔

بھذا اُمِرتَ۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

والمعنیٰ ھذا الذی امرت بہ (بالفتح) ان تصلیہ کل یوم وليلة وروی بالضم ای ھذا الذی امرت بتبلیغہ لک[1]

(اور حضرت جبرئیل کے اس لفظ کے معنی ت کے زبر کی صورت میں یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی انہی اوقات میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور ت کے پیش کی صورت میں جو ایک روایت ہے معنی یہ ہونگے کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ حکم پہنچانے کا حکم اسی طرح کیا گیا تھا)۔

بہر حال صیغہ مخاطب ہو یا متکلم کا اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنت اللہ یہی ہے کہ اپنے احکام و اوامر، عبادات و طاعات کے طریقے، اوقات اور آداب اس طرح سکھائے جاتے ہیں کہ ایک فرشتہ ان اعمال کو بجا لا کر دکھاتا ہے۔

---

[1] العسقلانی، احمد بن حجر، (فتح الباری شرح صحیح البخاری) لاہور، ۱۹۸۱ء: ج ۲: ص ۵: (باب مواقیت الصلوٰۃ وفضلہا)

اور اس کے وہ تمام اعمال حکم خداوندی کے تابع ہوتے ہیں اور نبی پر ان کا اتباع ایسے ہی واجب ہوتا ہے جیسے کسی قول وحی کا۔

یہ تو طریقہ تھا نبی کے لیے اپنے احکام کی وضاحت و تفصیل کا اور دوسرے عباد کے لیے یہ طریقہ متعین کیا گیا کہ انبیاء کے تمام اعمال و افعال کو امت کے لیے ہر حالت میں قابل تقلید بنا دیا اور یہ واضح کر دیا کہ نبی کا کوئی قول، فعل، اللہ کے حکم سے ہٹ کر یا اس کے مخالف نہیں ہوتا اور اس کی تمام حرکات و سکنات بیداری کی حتی کہ حالت نوم بھی صرف اور صرف اللہ کے حکم کے تابع ہیں اور جس طرح نبی پر اس فرشتہ معلم کا اتباع واجب ہے کہ وہ بامر خداوندی نازل ہوا ہے، امت پر اس نبی کا اتباع واجب و ضروری ہے کہ وہ بھی مامور من اللہ اور معصوم من اللہ ہے۔ بلکہ ہم گذشتہ اوراق میں آیات قرآنیہ کی رو سے ثابت کر چکے ہیں کہ انبیاء کا مقام فرشتوں سے بڑھ کر اور بلند تر ہوتا ہے تو جب ملائکہ کی تقلید انبیاء کے لیے بحکم خداوندی ضروری ٹھہری تو انبیاء کی تقلید امت کے لیے بدرجہ اولیٰ واجب ہوگی

**دلیل ۶** اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علينا جمعه وقرآنه فاذا قرأنه فاتبع قرآنه ثم ان علينا بيانه"۔ [۱]

(آپ قرآن کے ساتھ جلدی کرنے میں اپنی زبان کو حرکت نہ دیں ہمارے ذمے ہے اس کو (آپ کے دل میں) جمع کرنا، پس جب ہم (فرشتے کی زبانی) پڑھ رہے ہوں تو اس کے پیروی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہیں پھر ہم پر واجب ہے اس کا بیان۔

اس آیت کریمہ پر اگر غور کیا جائے تو اس آیت سے مندرجہ ذیل پہلوؤں سے حدیث کی حجیت ثابت ہوتی ہے۔

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب حضرت جبرئیل وحی لے کر آتے تھے، اور وحی کی آپ

---

[۱] القیامۃ: ۱۶ تا ۱۹

کے سامنے تلاوت کرتے تو آپ اس اہتمام اور فکر میں کہ کہیں وحی کے الفاظ ذہن سے نکل نہ جائیں۔ آپ حضرت جبرئیل کے ساتھ ساتھ تلاوت کرتے تاکہ وحی کے الفاظ پوری طرح ذہن نشین ہو جائیں اور ان میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ چنانچہ آیہ مبارکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس فکر میں حضرت جبرئیل کے ساتھ نہ پڑھا کریں، یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کو آپ کے دل میں جمع کرائیں اور پھر آپ کی زبان سے ادا کروائیں۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے حاصل کرنے اور اسے محفوظ کرنے میں اس قدر فکر و اہتمام کرتے تھے کہ شدید مشقت میں مبتلا ہو جاتے۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات میں حد درجہ متفکر و محتاط تھے کہ وحی کے الفاظ کے حفظ اور ان کے تحمل میں کوئی غلطی یا کمی بیشی نہ ہو۔ اور اس احتیاط کے لیے وہ اپنے جسم مبارک پر تکلیف بھی برداشت کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقہ معمول کو دیکھ کر یہ کیسے متصور ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کے الفاظ، اس کے معانی اور اسرار و رموز ضائع کر سکتے تھے۔

مزید برآں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ تئیس ۲۳ سالہ دورِ نزول قرآن میں ایسے افراد تیار کرنے پر قادر نہ تھے کہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کے متون، تشریحات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کو محفوظ نہ کر سکیں۔

(۲) دوسرے رخ پر اگر اس آیت کریمہ پر غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے جو کام اپنے ذمہ لیے وہ یہ ہیں۔

(۱) ان علینا جمعہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اسے جمع کرنا)

(۲) وقرآنہ (جمع کرنے کے بعد اسے زبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ادا کروانا)

(۳) ثم ان علینا بیانہ (پھر اس کا بیان و وضاحت)۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے پہلی دو ذمہ داریوں کے درمیان واؤ کا لفظ اور دوسری اور تیسری کے درمیان ثم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ واؤ اور ثم یہ دونوں حروف عربی زبان میں عطف کیلیے استعمال ہوتے ہیں اور عربی قواعد کا یہ اصول ہے کہ معطوف یعنی جس کو عطف کیا جائے معطوف علیہ سے یعنی جس پر عطف کیا جا رہا ہے علاوہ کوئی چیز ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی چیز کے دو عنوانوں کو معطوف اور معطوف علیہ بنا دیا جائے اس قاعدے کی رو سے جمع قرآن، تلاوت قرآن، اور بیان قرآن تین مختلف چیزیں ہو گئیں۔ اور تین چیزوں کو خدا نے اپنے ذمہ لے لیا، یعنی جس طرح خدا اس قرآن اور اس کے الفاظ کی حفاظت کرے گا، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بیان کردہ اس کی توضیحات، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے واضح شدہ اس کی صورتوں کی حفاظت کرے گا۔

واؤ اور ثم کے بارے میں علمائے اصولین کا مسلک یہ ہے۔

الواؤ للجمع المطلق وقیل ان الشافعی جعلہٗ للترتیب"۔ [1]

(واؤ محض جمع کے لیے آتا ہے اور کہا گیا ہے امام شافعی نے اس کو ترتیب کیلیے بھی استعمال کیا ہے)۔

ثم للتراخی لکنہٗ عند ابی حنیفۃ یفید التراخی فی اللفظ والحکم وعندھما یفید التراخی فی الحکم۔ [2]

(ثم تاخیر کے لیے ہوتا ہے لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک لفظ اور حکم میں اور صاحبین کے نزدیک صرف حکم میں تراخی کے لیے ہے۔

اس اصول کی رو سے معلوم ہوا کہ جمع و تلاوت کے درمیان تو کوئی تاخیر نہ ہو گی۔ یعنی جیسے ہی وحی نازل ہو گی بغیر کسی تاخیر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں محفوظ ہو جائے

---

[1] اصول الشاشی

[2] ایضاً،

گی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بلا تاخیر تلفظ کر سکیں گے۔ لیکن اسکا بیان اور تفسیر و وضاحت کچھ تاخیر کے بعد ہوگی۔

اللہ تعالےٰ نے جب تین چیزوں کو اپنے ذمہ میں لیا تو یہ تصور نا ممکن و محال ہے کہ وہ دو چیزوں میں تو اپنی پوری ذمہ داری کرے اور تیسری چیز یعنی بیان میں وہ ذمہ داری پوری کرنے پر قادر نہ ہو یا قدرت کے باوجود نہ کرے۔ لامحالہ وہ الفاظ قرآنی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بیان کردہ تشریحات و توضیحات کی بھی حفاظت کرے گا۔

دلیل ۶: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور قدر و منزلت صحابہؓ اور پھر امت محمدیہ کے دل میں پیدا و ثابت کرنے کیلیے اللہ تعالےٰ نے ان الفاظ کے ساتھ تاکید فرمائی ۔

یا یہا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجہروا لہ بالقول کجہر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون۔[1]

(اے ایمان والو! اونچی کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اور اس سے نہ بولو تڑخ کر جیسے تڑختے ہو ایک دوسرے اور پر کہیں اکارت ہو جائیں تمہارے کام اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

آیہ مبارک میں امت کو یہ ہدایت دی گئی کہ اپنی آوازیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اونچی نہ کریں اور اگر انہوں نے اس چیز کا ارتکاب کیا تو ساری زندگی میں جسقدر بھی نیکیاں کی ہوں گی، بلا تاخیر ختم کر دی جائیں گی اور افراد امت کو اس کا احساس تک نہ ہوگا۔

آدمی جب کسی دوسرے شخص کی آواز سے اپنی آواز بلند کرتا ہے تو گویا وہ اس کی آواز دبا رہا ہے اور اس کی بات کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

---

[1] ۴۹ : الحجرات - ۲

آواز کو دبانا محض یہی نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زور سے بولنے کی ممانعت ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی درجہ میں بھی توہین کرنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو غیر اہم سمجھنا اور ان کی حجیت سے انکار کرنا یہ تمام باتیں اس آیت کے ضمن میں آگئیں۔ کیونکہ آواز اونچی کرنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی اہمیت کو کم کرنا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے کے مترادف ہے۔

مولانا محمد مالک کاندھلوی لکھتے ہیں؛

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانا یا ایسی کوئی حرکت کرنا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر تکدر واقع ہو اصل ایمان ہی کی بربادی کا باعث ہے۔ جیسا کہ سورۃ احزاب میں واضح طور پر اعلان فرما دیا گیا؛

"ان الذین یوذون اللہ ورسولہٗ لعنھم اللہ فی الدنیا والآخرۃ" [1]

اعمال کے برباد ہونے کے متعلق ایک اور آیت میں اللہ تعالےٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں؛

"ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ وشاقوا الرسول من بعد ما تبین لھم الھدیٰ لن یضروا اللہ شیئًا و سیحبط اعمالھم" [2]

ترجمہ: جو لوگ منکر ہوئے اور روکا اللہ کی راہ سے اور خلاف ہوئے رسولؐ سے بعد اس کے کہ واضح ہو چکی ان پر ہدایت نہ بگاڑ دیں گے اللہ کا کچھ اور وہ ضائع کردے

---

[1] کاندھلوی، محمد مالک، مولانا، تکملہ معارف القرآن، لاہور ۱۹۸۳ء جلد ۶، صفحہ ۴۴۴۔

[2] ۴۷۔ محمد۔ ۳۲۔

گا انکے عمال، گویا آیہ مبارکہ میں جن اعمال کی دھمکی دی گئی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) کفر۔

(۲) اللہ کی راہ سے دوسروں کو روکنا۔

(۳) رسول اللہ کی مخالفت۔

گویا کفر اور دوسروں کو کفر کی دعوت دنیا کے عظیم ترین جرم ہیں اور اگر ان کے بعد کوئی تیسرا جرم ہے تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور ان کو اذیت و تکلیف پہنچانا ہے۔

دیگر یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانا اللہ تعالیٰ کی لعنت کا انسان کو مستحق بنا دیتا ہے اور اللہ کی لعنت کا مطلب یہ ہے کہ جس انسان کو اللہ اپنی لعنت کا مورد قرار دے اسکو اپنی رحمت اور حق کی ہدایت سے محروم رکھتا ہے شیطان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے علیک لعنتی الی یوم الدین، یعنی قیامت تک اسے لعنت خداوندی کا مورد قرار دے کر رحمت و ہدایت سے محروم کر دیا گیا۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبی تکدر اور تکلیف کا باعث بنتے ہیں، وہ دراصل شیطان ہی کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے خدا نے ان کے لیے بھی وہی سزا متعین فرمائی۔ جو خود شیطان کے لیے ہے۔

دلیل ۸: اللہ تعالیٰ نے نزول قرآن کا مقصد یہی بیان کیا کہ مخلوق کی ہدایت کے لیے جو کلام صحیح و بلیغ حکمت سے بھرپور اور ان خزائن سے معمور جو اب تک کتب سماویہ میں موجود تھے نازل کیا گیا چونکہ یہ کتاب امت کا ہر فرد کی عقل و دانش اور علم و زھد و تقویٰ میں اسقدر راسخ نہ ہوگی۔ کہ وہ اس کلام کی صحیح مراد کو اپنی عقل و فکر سے سمجھ سکے اور ہدایت حاصل کر سکے اس لیے ارشاد ہوا۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون[1]

(ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اتارا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کیلئے اس کتاب کے معانی بیان فرمائیں کہ جو ان کی ہدایت کیلئے اتاری گئی تاکہ اسکے بعد لوگ اس میں غور کریں)

---

[1] ۱۶: النحل: ۴۴۔

یعنی قرآن کریم کے حقائق و دقائق مجملات و مشکلات کی توضیح و تشریح امت کا ہر فرد کرنے سے قاصر ہوگا ان کی تفسیر کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال ہی معتبر ہونگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو قرآن سے جدا کرکے اگر کوئی شخص محض زبان دانی اپنی عقل و فکر اور ذہن و دانش سے سمجھنے کی کوشش کرے گا تو قرآن کے صحیح مفہوم اور معنی و مراد کو نہیں سمجھ سکتا اور گمراہی کی راہ اختیار کرے گا۔

جس طرح کوئی شخص طب کی کتاب کو محض زبان دانی کی بنا پر نہیں سمجھ سکتا بلکہ اس کو وہ کتاب سمجھنے کے لیے بھی کسی طبیب و ڈاکٹر کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح طب روحانی کی کتاب قرآن کریم محض لسانی مہارت اور زبان پر عبور حاصل ہونے سے کسی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ مولانا کاندھلویؒ لکھتے ہیں۔

"منکرین حدیث کا مقصد یہ ہے کہ جس طبیب روحانی (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) پر جس طب روحانی (قرآن کریم) کا نزول ہوا اور جس ذات بابرکات پر خدا کا فرشتہ طب روحانی کا صحیفہ لے کر اترا اس طب روحانی کے متعلق اس طبیب روحانی کی کوئی شرح اور تفسیر حجت اور معتبر نہیں اور ہماری لولی لنگڑی اور لونجی عقل جو روحانی حیثیت سے سل، دق، جذام، مالیخولیا اور سرسام میں مبتلا ہے وہ آیت قرآن کا جو الٹ سلٹ مطلب بیان کردے وہ سب معتبر و مستند ہے"[1]

مزید برآں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ عرب، عجمیوں سے بہت زیادہ عربی زبان میں عبور و مہارت رکھتے ہیں اور پھر خصوصاً اہل مکہ کی عربی دانی اور عربی پر عبور تو تاریخ میں ممتاز ہے۔ زمانہ جاہلیت کے ادباء اور شعراء کے تذکروں سے ادب عربی بھرا پڑا ہے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان عربوں میں بھی سب سے زیادہ فصیح اللسان تھے

---

[1] کاندھلوی م ا: حجیت حدیث؛ ص ۳۹۰۔

تو اگر ان لوگوں کی جو زبان عربی میں اس قدر ماہر تھے، خواہ وہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یا آپ کے صحابہ کی قرانی تشریح و وضاحت حجت و معتبر نہیں تو ہماری اپنی عقل کی اختراعی تفسیر و وضاحت کس طرح حجت ہو سکتی ہے۔؟

اس پر مستزاد یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کے اقوال تفسیری کو جدا کر کے تو پورے قرآن پر عمل کیا قرآن کے ایک حکم پر بھی عمل نہیں ہو سکتا مثلاً قرآن میں نماز کا قائم کرنے کا حکم بارہا دیا گیا لیکن اس کی ہیئت اور اس کا طریقہ متعین نہیں کیا گیا لہذا قرآن کے اس حکم پر عمل کرنے کے لیے ہمیں سنت کا سہارا لینا پڑے گا۔

دلیل ۱۲ وما اتاکم الرسول فخذوہ ومانہاکم عنہ فانتھوا واتقوا اللہ۔(الحشر:۷)

(جو تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا اس کو لے لو اور جس سے منع کیا، اس سے رک جاؤ)

اس آیت کی تشریح و وضاحت اور مفسرین کے اقوال نقل کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم منکرین حدیث کی جانب سے اس آیت پر کئے گئے چند اشکالات کا ازالہ کر دیں جن کا خلاصہ و نچوڑ یہ ہے کہ یہ آیت عام نہیں اور حدیث ومانہاکم میں داخل ہے نہ کہ وما اتاکم اور مانہاکم سے رک جانے کا حکم قرآن نے دیا۔

مقام حدیث میں اس اشکال کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

اس اشکال کو ہم تین اجزأ میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

ا۔ یہ آیت مال فے کے بارے میں ہے عام حکم نہیں۔

(ب) آتاکم سے مراد کسی مادی اور جسمانی چیز کا دینا ہوتا ہے، جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مجموعہ احادیث کتابی شکل میں امت کو نہیں دیا۔

(ج) احادیث ومانہاکم میں داخل ہیں نہ کہ وما اتاکم میں

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ آیت مال غنیمت سے متعلق ہے اور اس کے شان نزول میں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے، مفسرین کے نزدیک اگرچہ اس آیت کا مورد

خاص ہے لیکن ہر آیت کا مورد اس کا شانِ نزول ہوتا ہے، اس کے حکم کی علت نہیں ہوتا یعنی اگر اس خاص واقعہ کو ہم اس حکم کی علت بنالیں تو جب وہ واقعہ نہ ہو تو اس آیت کا حکم ختم ہو جائے گا، بلکہ آیت کا حکم ہمیشہ اگر الفاظ عام ہوں تو عام ہوتا ہے اور بلا کسی قرینہ کے، اس کی تخصیص کرنا اصولاً جائز نہیں ہوتا۔ اگر ہم ان تمام آیات کو شانِ نزول کے ساتھ خاص کر دیں جو کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے پر نازل ہوئی ہوں تو قرآن کی ہمہ گیری اور عالمگیری حیثیت، یہ دعویٰ کہ قرآن قیامت تک کے لیے، اور یہ کہنا کہ قرآن ایک جامع کتاب ہے مشکوک ہو جائے گا۔ مثلاً آیت:

قل اللھم ملک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء۔

ترجمہ: (اے نبی) (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجیے کہ بیشک سلطنتوں کے مالک اللہ تعالیٰ ہیں وہ جس کو چاہیں بادشاہت عطا کریں اور جس سے چاہیں بادشاہت چھین لیں)۔

اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق مفسرین لکھتے ہیں کہ غزوہ احزاب کے موقع پر جس وقت خندقیں کھودی جارہی تھیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس کام میں مشغول تھے ایک جگہ ایک چٹان نمودار ہو گئی جو صحابہ سے نہ ٹوٹتی تھی، صحابہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور درخواست کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر ضرب لگائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی ضرب لگائی ایک روشنی نمودار ہوئی کہ جیسے اندھیرے میں چراغ روشن ہو گئے ہوں، آپ نے فرمایا مجھے حیرہ کے محلات دکھائے گئے ہیں دوسری بار کدال مارنے پر روشنی ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس روشنی میں روم کے سرخ محلات دکھائے گئے ہیں۔ یہ فرما کر پھر تیسری کدال ماری پھر ویسی ہی روشنی نمودار ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس روشنی میں صنعاء یمن کے محلات دکھائے گئے ہیں۔ اور مجھے جبرئیل امین نے خبر دی ہے کہ ان سب ممالک پر میری امت کا تسلط اور غلبہ ہوگا کفار اور منافقین نے یہ سنا تو مذاق اڑانے لگے کہ تمہارا نبی بھی خوب ہے۔ یثرب میں بیٹھا ہے دشمن کے خوف سے خندق کھود رہا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے روم حیرہ اور صنعاء کے محلات

دکھلائی دیتے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کفار کو کہہ دیجئے کہ سلطنتوں کا مالک خدا ہے جسے چاہے عطا کر دے اور جسے چاہے محروم کر دے[۱] ۔

اس شانِ نزول کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کی یہ صفت محض روم و فارس کی سلطنت مسلمانوں کو دلانے کے لیے ہے بلکہ یہ صفت عام ہے کہ اللہ قادرِ مطلق ہے جب چاہے، جسے چاہے جس علاقہ کا چاہے حکمران بنا دے اور جب چاہے حکمرانی سے محروم کر دے اگر ہم اس آیت کے شانِ نزول کو ان صفات کی علت بنا دیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جب مسلمان روم و فارس پر فاتح بن کر حکمران ہو جائیں گے تو نعوذ باللہ اللہ کی صفت مالکیت ختم ہو جائے گی۔

لہٰذا یہاں بھی یہی بات ہے کہ اگرچہ آیت کا شانِ ورود ایک خاص واقعہ اور ایک خاص چیز ہے لیکن الفاظ کے عموم کی وجہ سے یہ حکم عام ہے، اب جو بھی کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انجام دیں، جس کے کرنے کا حکم فرمائیں وہ سب کا سب "ما آتاکم" میں اور جس کام سے منع فرما دیں وہ "ما نہاکم" میں داخل ہے۔

امام رازیؒ جو مفسرین میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

والاجود ان تکون ھذہ الاٰیۃ عامۃ فی کل ما اتی رسول اللہ ونہیٰ عنہ وامر، الفیٔ داخل فی عمومہ۔[۲]

(زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس آیت کو عام پر محمول کیا جائے اور یہ کیا جائے جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا بصورت امر یا بصورت نہی سب کو شامل ہو۔ اور فیٔ کا حکم بھی اسی عموم میں داخل و شامل ہو۔

---

[۱] مولانا محمد ادریس کاندھلوی، معارف القرآن: ۱: ۷۶ ، ۴ طبع لاہور ۱۹۸۲ء

[۲] رازی، فخر الدین، امام، التفسیر الکبیر طہران: ج ۲۹، ص ۲۸۹

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں ۔

ان مہما امرکم بہ فافعلوہ ومہما نہاکم عنہ فاجتنبوہ فانہ یامر بخیر وانما ینہیٰ عن شر ۔ [1]

(ان تمام کاموں کو سرانجام دو جن کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور ان تمام کاموں سے رک جاؤ جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں ۔

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے ہمدرد و خیر خواہ ہیں اور کیوں نہ ہوں قرآن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتوں کو عالمین کے لیے بیان کرتا ہے ۔ تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ رحمتیں، ہمدردیاں اپنے ماننے والوں، اپنے جان نثاروں اپنے مطیعین ومحبین کے لیے نہ ہونگی ؟ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی حکم دیں گے، امت کی اس میں بھلائی ہوگی اور جس بات سے منع فرمائیں گے، اس کا انجام دینا امت کے لیے بھلائی کا سامان نہ ہوگا ۔ علامہ آلوسی روح المعانی میں کشاف کی ایک اصولی دلیل نقل کرتے ہیں ۔ فرمایا :

وفی الکشاف الاجود ان تکون عامۃ فی ما امر بہ صلی اللہ علیہ وسلم ونہیٰ عنہ وامر الفی داخل فی العموم وذالک لعموم لفظ (ما) ۔ [2]

(کشاف میں ہے کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم اور نہی کے لیے عام ہو اور فئی کا حکم اس عموم میں داخل ہو بوجہ لفظ "ما" کے عموم کے)

یعنی اصولاً "ما" کا لفظ عام چیز کے لیے بولا جاتا ہے اور جب تک اس عموم پر عمل ناممکن نہ ہو، اس کی تخصیص جائز نہیں ۔

---

[1] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم : ج ۴، ص ۳۳۷

[2] آلوسی، ابی الفضل شہاب الدین، السید، روح المعانی، بیروت، ج ۲۸ : ص ۵۰

مزید یہ کہ آیت کا سیاق و سباق اسی بات کا متقاضی ہے کہ آخر میں حکم دیا جاتا ہے واتقوا اللہ (اللہ کا تقوی اختیار کرو) یہ حکم عام ہے اور ہر حالت، ہر وقت، ہر زمانہ اور ہر کیفیت کے لیے خواہ، جنگ ہو یا امن، غربت ہو یا امارت، غلامی ہو یا حکومت اس بات کا کوئی دعوی نہیں کر سکتا کہ اللہ کے تقوی کا حکم صرف اسی واقعہ کے ساتھ خاص ہے۔ ایک ہی آیت کے نصف کو خاص اور نصف کو عام ماننا اصول کے لحاظ سے غلط ہے۔ اشکال کا دوسرا جزو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مجموعہ احادیث امت کو نہیں دیا اس لیے وما آتاکم میں نہیں آسکتا۔ یہ اعتراض اس وقت صحیح تھا جب کہ اتاکم کا لفظ محض کسی مادی اور جسمانی چیز کے دینے کے لیے استعمال ہوتا۔ یا پھر آتاکم کے لفظ میں ایسے معنیٰ نہ پائے جاتے جس میں کوئی غیر مادی چیز داخل ہو سکتی ہو۔ حالانکہ اتاکم کی وضاحت کرتے ہوئے امام راغب لکھتے ہیں:

"والاتیان یقال للمجیٔ بالذات وبالامر وبالتدبیر، و یقال فی الخیر وفی الشر والاعیان والاعراض۔"[1]

ترجمہ: اور اتیان کا لفظ بذات خود آنے کیلیے اور کسی معاملہ یا تدبیر کے پیش آنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مزید اس کو خیر و شر، اجسام اور سامان کے آنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

گویا بالذات، اعیان اور اعراض میں تو مادی و جسمانی چیزیں اور امر، تدبیر، اور خیر و شر میں ایسے امور آگئے جو کسی قول یا خبر کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان تمام کے لیے اتیان کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ کتاب، حسنہ، سیئہ، علم، حکمت ان سب کے لیے استعمال ہوا ہے

خذوا ما اتیناکم بقوۃ واذکروا ما فیہ لعلکم تتقون۔[2]

---

[1] الاصفہانی، مفردات، صفحہ ۸۔

[2] ۷۔ الاعراف: ۱۷۱۔

ترجمہ: پکڑلو اس کو جو ہم نے تم کو دیا (کتاب توراۃ) اور نصیحت حاصل کرو شاید تم تقویٰ والے ہو جاؤ۔

واتیناہُ فی الدنیا حسنۃ وانہٗ فی الاخرۃ لمن الصالحین۔[1]

ترجمہ: ہم نے ان (حضرت ابراہیمؑ) کو دنیا میں نیکی دی اور وہ آخرت میں نیک لوگوں میں سے ہوں گے۔

ففہمنٰہا سلیمٰن وکلا اتینا حکماً وعلماً۔[2]

ترجمہ: پھر سمجھا دیا ہم نے سلیمانؑ کو وہ فیصلہ۔ اور دونوں کو دیا تھا ہم نے حکم اور سمجھ۔

ولقد اتینا لقمٰن الحکمۃ ان اشکر اللہ۔[3]

ترجمہ: اور ہم نے دی لقمان کو دانش تاکہ وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔

گویا قرآن نے جہاں کتاب کے لیے اتیان کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں حکم، علم، حکمت کے لیے بھی استعمال کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں مادی نہیں۔

ان وضاحتوں، تفصیلات اور تشریحات سے واضح ہو گیا کہ احادیث وما اتاکم میں بھی اور ما نہاکم میں داخل ہیں۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اوامر، تمام افعال اور وہ تمام چیزیں جن کے وقوع کے علم پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نکیر اس وقت یا بعد میں نہیں فرمائی تمام کی تمام وما اتاکم میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام نواہی وہ تمام امور جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری زندگی پرہیز فرماتے رہے۔ اور وہ تمام امور جن کا انجام پانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔ یہ تمام وما نہاکم میں داخل ہیں۔

یہ چند آیات قرآنیہ تھیں جو حجیت حدیث کے دلیل کے طور پر پیش کر دیں خیال تو یہ تھا کہ ان تمام آیات پر منکرین حدیث کی طرف سے جو جو اشکالات کیے گئے ان تمام

---

[1] ۱۶: النحل: ۱۲۲۔

[2] الانبیاء: ۷۹۔

[3] ۳۱۔ لقمان: ۱۲۔

کو بھی نقل کرتا اور سب کے بالتفصیل جواب دیتا لیکن طوالت کے خوف سے باز رہا اور آئندہ (انشاء اللہ) کسی وقت کے لیے رکھ چھوڑا البتہ بعض آیات پر جو اشکالات تھے وہ نقل کر دیئے۔

اب ہم ان احادیث کا جائزہ لیں گے کہ جو حجیت حدیث پر دلالت کرتی ہیں۔ اور بعض صحابہ کے احوال و آثار بھی نقل کریں گے، جس سے اندازہ ہوگا کہ صحابہ کے ہاں حدیث کی کس قدر عظمت تھی۔

دلیل ۱: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں جسے امام بخاری نے نقل کیا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام امت کے جنت میں داخلہ کی بشارت دی لیکن منکر کو اس بشارت سے مستثنیٰ قرار دیا۔ فرمایا:

کل امتی یدخلون الجنۃ الا من ابی قالو یارسول اللہ ومن ابیٰ قال من اطاعنی دخل الجنۃ ومن عصانی فقد ابیٰ۔[۱]

ترجمہ: میرا ہر امتی جنت میں داخل ہوگا سوائے اس کے جس نے انکار کیا، صحابہؓ نے دریافت کیا انکار کرنے والوں میں کون داخل ہیں فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی وہ منکر ہوا۔

گویا اسلام و کفر اور جنت میں داخلہ یا اس سے محرومی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت یا نافرمانی پر منحصر ہے۔

دلیل ۲: ابوہریرۃ کی روایت مرفوعاً امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کی ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ۔[۲]

---

[۱] صحیح بخاری، بیروت، جلد ۹، صفحہ نمبر ۱۱۔ (کتاب الاعتصام)

[۲] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۷۷ (کتاب الاحکام)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔

منکرین حدیث کہتے ہیں کہ ہم صرف اس حدیث کو مانیں گے جس کی تائید میں کوئی آیت پیش کی جائے گی اس حدیث کی تائید میں ہم ایک آیت پیش کرتے ہیں:

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ ؎۱

ترجمہ: اور جو رسول کی اطاعت کرے تو گویا اس نے اللہ کی اطاعت کرلی۔

ومن یعص اللہ ورسولہٗ فان لہ نار جہنم خالدین فیہا ابداً۔ ؎۲

ترجمہ: جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہنے والا ہوگا۔

منقولہ بالا دونوں احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اطاعت کرنیوالے کو ناجی اور نافرمانی کرنے والے کو مستحق دوزخ بنایا ہے اور دونوں آیات بھی اسی کو ظاہر کررہی ہیں۔

دلیل ۳: امام بخاریؒ نے کتاب الاعتصام میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں چند فرشتوں کا اس وقت آنا بیان کیا گیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حالت نوم میں تھے۔ ان فرشتوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مثال سے تشبیہ دی کہ کوئی شخص گھر بناتا ہے اور اس میں عمدہ دستر خوان پر نعمت ہائے خداوندی کھانے کے لیے چن دیتا ہے۔ اور پھر لوگوں کو دعوت دیتا ہے، چنانچہ جو شخص دعوت کو قبول کرتا ہے، وہ اس گھر میں داخل ہو جاتا ہے اور اس میں موجود نعمتیں کھاتا ہے اور جو دعوت کو قبول نہیں کرتا وہ داخلہ اور دستر خوان کی نعمتوں سے بھی محروم رہتا ہے۔ اس مثال کو بیان فرمانے کے بعد ان ملئکۃ مثل لہٗ نے بیان کیا کہ وہ گھر جنت ہے۔ اور اس گھر کی طرف بلانے

---

؎۱ ۴: النساء: ۸۰۔ ؎۲ الجن: ۲۳۔

والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس مثال کو بیان کرنے کے بعد وہ ملئکۃ کہتے ہیں

فمن اطاع محمداً صلی اللہ علیہ وسلم فقد اطاع اللہ ومن عصی محمداً فقد عصی اللہ۔ [1]

ترجمہ: پس جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔

اور ملئکۃ کے متعلق اللہ تعالیٰ عصمت کی گواہی دیتے ہیں۔

لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون۔ [2]

ترجمہ: (وہ خدا کی (ذرا) نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں بھی جو وہ ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ اس کو فوراً بجا لاتے ہیں۔)

یعنی ملئکۃ کا ہر قول وفعل، ہر حرکت وسکون اللہ کے حکم کے تابع ہے اور وہ ذرہ برابر بھی ادھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح ان کا یہ فرمانا کہ جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور ایک عجیب لطیف نکتہ ان کے قول میں یہ رکھا ہوا ہے کہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ جس نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی بلکہ یہ کہا کہ جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی یعنی محمد مطاع مطلق ہیں ان کی ذات کی اتباع اور ان کے ہر حکم کی پیروی خواہ وہ بحیثیت نبی دیں، یا بحیثیت ایک انسان تمام کی پابندی ضروری ہے۔ اسی طرح ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔

دلیل ۴: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء سابقین پر اپنی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ما من الانبیاء نبی الا اعطی من الایات ما مثلہ، اومن

---

[1] بخاری، جلد ۹، صفحہ ۱۱۵۔

[2] ۶۶: التحریم ۶۔

او آمن علیہ البشر وانما کان الذی اوتیت وحیاً اوحی
اللہ الی فارجوا انی اکثرھم تابعاً یوم القیمۃ۔[1]

ترجمہ: ہر نبی کو جس قدر آیات دی گئی ہیں اسی قدر اس پر ایمان لایا گیا یا (اسی قدر) لوگ ایمان لائے اور مجھے تو وحی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف بھیجی ہے' اسی لیے مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میری پیروی کرنے والے لوگ بہت زیادہ ہوں گے)۔

اس حدیث کی تائید میں درج ذیل آیت پیش کی جا سکتی ہے۔

فاوحیٰ الی عبدہ ما اوحیٰ۔[2]

(پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمائی)

اس آیت میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بیان کیا گیا ہے۔

لیکن سوال طلب بات تو یہ ہے کہ وحی تو انبیاء سابقین پر بھی آئی تھی۔ قرآن کریم نے انبیاء پر وحی کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے۔

واوحینا الی موسیٰ واخیہ۔[3]

ترجمہ: ہم نے موسیٰ پر وحی اتاری۔

انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ و
اوحینا الیٰ ابراھیم واسمعیل واسحٰق ویعقوب
والاسباط وعیسیٰ وایوب ویونس وھرون و
سلیمن۔[4]

ترجمہ: بیشک ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی جیسے نوح پر اور ان کے بعد نبیوں پر

---

[1] بخاری: جلد ۹، صفحہ ۱۱۳۔
[2] ۵۳۔ النجم: ۱۰۔
[3] ۱۰: یونس: ۸۷۔
[4] النساء: ۱۶۳۔

رہم نے وحی کی ابراہیم پر، اسمٰعیل پر، اسحٰق پر، یعقوب پر، اولادِ یعقوب پر، عیسیٰ پر، ایوب پر، یونس پر، ہارون پر اور سلیمان علیہم السلام پر)

آیت قرآنی کی رو سے مندرجہ بالا تمام انبیاء پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر وحی کے نزول کو کس بنا پر خصوصیت اور اپنی امتیازی شان کے ساتھ ذکر کیا؟۔

ابن حجر عسقلانیؒ اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں۔

ان القرآن اعظم المعجزات وافیدھا وادومھا لاشتمالہ علی الدعوۃ والحجۃ ودوام الانتفاع بہ الی آخر الدھر۔[1]

ترجمہ: کہ قرآن کریم عظیم ترین معجزہ ہے، سب سے زیادہ مفید اور ہمیشہ رہنے والا، اس وجہ سے کہ وہ دعوت پر مشتمل ہے اور اسکی حجیت وانتفاع دائمی ہے)

علامہ عینیؒ لکھتے ہیں۔

ان کل نبی اعطی من المعجزات ماکان مثلہ لمن کان قبلہ من الانبیاء فامن بہ البشر واما معجزتی العظمیٰ فھی القران الذی لم یعط احد مثلہ فھذا انا اکثرھم تبعا۔[2]

ترجمہ: ہر نبی کو ایسے معجزات دیئے گئے کہ ان کی مثال ان سے قبل کے انبیاءؑ میں موجود تھی۔ چنانچہ ان پر لوگ ایمان لائے لیکن میرا معجزۂ عظیم یہ قرآن کریم ہے۔ کہ جس کا مثل کسی کو بھی نہیں دیا گیا اس لیے میرے متبعین زیادہ ہوں گے۔)

یہ تو وہ امور تھے جو محدثین نے بیان کیے ان کے ساتھ ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ انبیاء سابقین کو وحی کی صرف ایک قسم یعنی وحی متلو عطا کی گئی تھی لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے وحی کی دوسری قسم وحی غیر متلو بھی عطا کی ہے۔ اور وہ میری احادیث ہیں اور دلیل اس بات کی

---

[1] عسقلانی، فتح الباری، ج ۱۳: ص ۴۲۸۔

[2] عینی، بدرالدین ابی محمد: العلامہ عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، دمشق، ج ۱: ص ۲۵

یہ ہے کہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایسے رسول ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن یہ گواہی دیتا ہے۔ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی ۔ لے یعنی حقیقت یہ ہے کہ جو بھی گفتگو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ جو بات بھی فرماتے ہیں، وہ وحی ہوتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے۔ اس قسم کی گواہی اللہ تعالیٰ نے انبیاء سابقین میں سے کسی کے لیے نہیں دی۔ کسی نبی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سو فیصد گفتگو کو وحی قرار نہیں دیا۔ لہٰذا اس امتیازی شان کی بناء پر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی متلو کے علاوہ وحی غیر متلو بھی عطا کی گئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ میرے ماننے والے، میری پیروی کرنے والے قیامت کے دن انبیاء سابقین کے متبعین کے مقابلہ میں زیادہ ہوں گے۔

دلیل ۵: تاریخ وحدیث کی روایات میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ خلافت پر متمکن ہوئے تو منکرین زکوٰۃ کا فتنہ اٹھا۔ مدینہ میں بعض لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور استدلال یہ پیش کیا کہ قرآن نے زکوٰۃ کے نتیجہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زکوٰۃ ادا کرنے والوں کیلئے دعا کرنیکا حکم دیا گیا ہے۔

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا وصل
علیھم ان صلوٰتک سکن لھم۔ لہ

ترجمہ: (آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ان کے مالوں میں سے صدقہ لیں جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پاک صاف کر دیں گے اور ان کے لیے دعا کیجیے بلاشبہ آپؐ کی دعا ان کیلئے موجب اطمینان ہوگی)۔

---

لہ ۹۔ التوبہ۔ ۱۰۳۔

اس آیت سے وہ استدلال کرتے تھے کہ اب جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے ہیں اب کسی کی دُعا موجب اطمینان نہیں ہو سکتی اور جس کی دُعا موجب اطمینان نہ ہو اور جو تزکیہ نہ کر سکے اسے زکوٰۃ دینا جائز نہیں،

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں سے قتال کا اعلان کیا اور جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ بات فرمائی کہ آپ ایسے لوگوں سے کیسے قتال کریں گے جو کلمہ گو ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

واللہ لو منعونی عقالاً کانو یؤدونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علیٰ منعہ۔ [1]

ترجمہ: (اگر کسی نے اس رسی کے دینے سے انکار کیا جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا کرتا تھا۔ تو خدا کی قسم میں اس سے ضرور قتال کروں گا)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایسے موقع پہ اتنی ظاہری شدت کیوں اختیار کی، کیا رسی کے بغیر جانور کی زکوٰۃ ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، یا رسی کے بغیر زکوٰۃ ادا کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے کہ اس سے قتال مومن کے لیے جائز ہو جائے؟ یہ اگر فقہی اعتبار سے دیکھا جائے تو دونوں سوالوں کا جواب نفی میں آئیگا۔

لیکن حضرت ابو بکر صدیق کی نظر اس سے کہیں زیادہ عمیق تھی۔ ان کے نزدیک ہر وہ کام جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انجام دیا جاتا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور قانون پر عمل سے انکار کرنے والے باغی ہوتے ہیں اور باغیوں کی سزا قتل ہی ہے۔ خواہ وہ قانون جس کو توڑا جا رہا ہے۔ اور جس پر عمل سے انکار کیا جا رہا ہے کس قدر معمولی کیوں نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اعمال حجت و قانون کی حیثیت رکھتے تھے۔

---

[1] بخاری: ج ۲: ص ۱۱۵۔

دلیل ۲۶: تمام صحابہ کرام بشمول حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ قرآن کے بعد مسائل کے لیے حدیث کو حجت مانتے تھے۔ اور اس بات کی تائید بارہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی فرما چکے تھے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیج رہے تھے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم کس چیز سے فیصلہ کرو گے؟ کہا قرآن سے پوچھا اگر قرآن میں نہ ہو؟ کہا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا اگر سنت میں بھی نہ ہو تو؟ کہا کہ پھر اجتہاد کروں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر جو کلمات فرمائے تھے ان کو نقل کر چکے ہیں۔ یہ چند جھلکیاں تھیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہ کے نزدیک حدیث حجت تھی اور وہ قرآن کے بعد حدیث کو ہی سب سے بڑا ماخذ سمجھتے تھے۔

اب ہم چند عقلی دلائل پیش کرتے ہیں جن سے مسئلہ مزید واضح ہو جائے گا۔

دلیل ۱: حدیث کی حجیت سے انکار کرنا اور قرآن پر حجیت کو ختم کر دینا اللہ اور اس کے رسولؐ کے درمیان تفریق پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تفریق پیدا کرنے والوں کے متعلق قرآن کہتا ہے۔

ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلاً اولئک ھم الکافرون حقا۔ [1]

ترجمہ: بے شک جو کفر کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور رسولوں کے درمیان تفریق پیدا کریں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم کتاب کے کچھ حصہ پر تو ایمان لاتے ہیں اور کچھ حصہ پر نہیں اور یہ چاہتے ہیں ان کے درمیان کوئی راستہ نکالیں بیشک یہ لوگ صریح کافر ہیں۔)

یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول میں جدائی پیدا کرتے ہیں، اللہ کو تو مطاع مانتے ہیں مگر رسول کو قابل اطاعت نہیں سمجھتے اور اللہ اور رسول کے درمیان راستہ اختیار کرنا چاہتے

---

[1] النساء: ۱۵۲

ہیں ایسے لوگوں کے کفر میں قطعاً کوئی شبہ نہیں۔
اور اہل ایمان کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول دونوں پر ایمان رکھتے ہیں، دونوں کو مطاع مطلق مانتے ہیں۔ فرمایا:

والذین امنوا باللہ ورسلہ ولم یفرقوا بین احد منھم اولٓئک سوف یوتیھم اجورھم وکان اللہ غفورا رحیما۔ لہ

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اللہ اور رسول کے درمیان تفریق نہ کی اللہ ایسے لوگوں کو عنقریب اجر و ثواب دیں گے بیشک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے مہربان ہیں۔

دلیل ۲:۔ یہ بات عام زندگی میں مشاہدہ ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق اس کے شہر کے عام لوگ اس بات کی شہادت دیں کہ یہ شخص اپنی زندگی میں عموماً سچ بولتا ہے تو ایسے شخص کی بات قابلِ قبول ہوگی حتیٰ کہ عدالت میں اسکی گواہی قبول کی جائے گی اور اس کے متعلق یہی تصور کیا جائے گا کہ وہ سچا ہے۔ اس سے منسوب جو بھی بات ہوگی وہ بھی صحیح اور سچی سمجھی جائے گی۔

اس حوالہ سے جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو دیکھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ اکثر اہل مکہ نہیں بلکہ تمام اہل مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو "صدوق وامین" کے لقب سے یاد کرتے، حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بھی امین اور سچا کہتے تھے۔ ابتدائے اسلام کا ایک واقعہ یوں منقول ہے۔

تین سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخفی طور پر اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ پھر بحکم خداوندی دعوت عام کا سلسلہ شروع ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر چڑھے اور قبائل قریش کو نام بنام پکارا جب سب جمع ہو گئے تو ارشاد فرمایا:

اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ پہاڑ کے عقب میں ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ آور ہونے

---

لہ ۴۔ النساء، ۱۵۲

والا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا، بیشک ہم نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوائے صدق و سچائی کے کچھ دیکھا ہی نہیں "

معلوم ہوا تمام اہل مکہ متفقہ طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا مانتے تھے۔ ایسے شخص کی بات کو قبول نہ کرنا جس کے متعلق اس کے دشمن بھی سچا ہونے کی شہادت دیتے ہیں خلاف عقل بات ہے یعنی جو بات بھی اس سے منسوب ہو گئی ہے سچی ہے۔

رہ گئی بات اس ذریعہ کی جس ذریعہ سے وہ ہم تک یعنی صاحب کتاب تک پہنچی۔ وہ ذریعہ صحابہ کرام اور تابعین ہیں اور قرآن بھی ہمیں اسی ذریعہ سے پہنچا۔ جب ہم قرآن کو مانتے ہیں تو حدیث کے ماننے میں کیا اشکال ہو سکتا ہے جب کہ ہم تک پہنچنے کا دونوں کا ذریعہ ایک ہی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لکھ لیا گیا تھا۔ تو کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔ اور جب کوئی وحی نازل ہوتی تو فوراً کاتب وحی کو بلا کر لکھوا دیتے۔ اگر کاتب وحی کے دل میں ذرا بھی کھوٹ ہو تو وہ کتابت میں جو چاہے تبدیلی کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس کی تبدیلی برقرار نہ رہتی مگر روایت میں اختلاف کا ثبوت مل جاتا۔ چنانچہ قرآن پر اس بات کے ایمان سے کہ یہ حرف بحرف ہم تک پہنچا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی صحابہ پر اعتماد کرنا پڑے گا اور جب صحابہ پر اعتماد کر لیا تو حدیث بھی انہوں نے ہی بیان کی اس کے قبول کرنے میں کیا تردد ہے۔

دلیل ۳ : اگر کسی حکمران کے پاس کسی دوسرے بادشاہ کا قاصد آتا ہے اور اس بادشاہ کے نام کوئی تحریری پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ بادشاہ پیغام وصول کرتا ہے اور اگر اس میں کوئی بات مجمل ہوتی ہے، کوئی مشکل ہوتی ہے، یا اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے تو اس پیغام کی جو تشریح وہ قاصد کرتا ہے وہ تشریح سب سے زیادہ قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے کہ اس بادشاہ کا نمائندہ خاص ہے نہ کہ وہ تشریح و وضاحت زیادہ ہوگی جو کہ مرسل الیہ خود کریں۔ چنانچہ اگر بقول منکرین حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مطاع مطلق نہ بھی مانا جائے اور بقول ان کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک قاصد کی (نعوذ باللہ) بنا دی جائے تب بھی وہ اللہ کے قاصد ہیں اور اللہ کا پیغام لے کر مخلوق کی طرف آئے ہیں، کیونکہ وہ اللہ کے خصوصی نمائندے ہیں اس لیے اپنے

لائے ہوئے پیغام کی جو وضاحت وہ خود کریں وہی سب سے زیادہ معتبر ہوگی۔

**دلیل ۱۲** : اگر ہم حدیث کو حجت نہ مانیں تو قرآن کا کلام الٰہی ہونا کس طرح معلوم ہوگا؟ علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں۔

"قرآن کو حجت مان کر سوال یہ ہوتا ہے کہ اس قرآن کا قرآن ہونا آخر ہمیں کیسے معلوم ہوا؟ اگر خود قرآن ہی سے معلوم ہوا کہ درحالیکہ ابھی خود قرآن کا قرآن ہونا ثابت شدہ نہ ہو، قرآن سے کسی چیز کا ثبوت کیسے ہو سکتا ہے؟ جسے تقدیم الشئ علی نفسہ کہتے ہیں۔ لامحالہ غیر قرآن ہی سے قرآن کا قرآن ہونا معلوم ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ غیر قرآن بجز پیغمبر کی خبر کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ جو منقول ہو کہ بلا کم و کاست ہم تک پہنچے اور اسی کا نام حدیث ہے۔ اس لیے قرآن کا قرآن ہونا خود حدیث پر موقوف نکلا"۔[۱]

علامہ عثمانی کے اس پر حکمت کلام پر اگر تجزیاتی طور پر غور کیا جائے تو مندرجہ ذیل نتائج مرتب ہوں گے۔

(ا) قرآن کا نزول شروع ہوگیا اور دوران قرآن کسی آیت میں یہ بتایا گیا کہ یہ قرآن ہے۔ یہ ایک احتمال ہے جس میں خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ جس مخبر نے یہ اطلاع دی ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے ابھی تک اس آیت کا کلام الٰہی ہونا ثابت نہیں۔

(ب) نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا کلام الٰہی ہونا کسی ایسی بات سے معلوم ہونا چاہیئے۔ جو قرآن میں داخل نہ ہو۔ بلکہ قرآن سے باہر ہو۔

(ج) وہ قرآن سے باہر کی چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول یا عمل کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔

(د) گویا قرآن کا یہ ثابت ہونا کہ یہ کلام الٰہی ہے اور منزل من اللہ ہے حدیث پر موقوف ہے۔

---

[۱] عثمانی، شبیر احمد علامہ، فضل الباری، کراچی ۱۹۷۳ء ج ۱، ص ۹۰۔

۵ - یہ اصول ہے عقل و فطرت کا کہ کوئی بھی قطعی چیز کسی ظنی خبر سے ثابت نہیں ہو سکتی قطعی امر کے ثبوت کے لیے کوئی قطعی خبر اور مخبر صادق ہونا چاہیے۔ جس کی خبر میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ اگر حدیث کو ہم ظنی الثبوت مان لیں تو اس سے قرآن کا کلام الٰہی ہونا جو قطعی الثبوت ہے ثابت نہیں ہو سکتا۔ لامحالہ حدیث کو قطعی الثبوت ماننا پڑے گا۔

دلیل ۵: قرآن ہم تک طریق متواتر سے پہنچا اور ہم نے اس کو حجت مان لیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو احادیث ہم تک طریق متواتر سے پہنچیں، ہم ان کو بھی حجت مانیں ورنہ علت ایک ہونے کے باوجود حکم متفرق ہو جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ قرآن کا تواتر اعلیٰ درجہ کا تواتر ہے اس سے کمال یقین حاصل ہو جاتا ہے تو حدیث کے تواتر سے یقین محض حاصل ہو جاتا ہے۔ گویا یقین تو حدیث کا بھی ہے مگر قرآن کی جو کیفیت ہے وہ یقین پر ایک اضافہ ہے اور اضافہ جب ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے جب اصل تسلیم کر لیا جائے اصل کو تسلیم کیے بغیر اضافہ کو قبول کرنا ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی نیچے کی منزل منہدم کر کے اوپر کی منزل میں رہنے کا دعویٰ کرے۔ چنانچہ احادیثِ متواترہ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

اب ایک قدم مزید آگے بڑھائیے کہ متواتر حدیث کی ایک قسم ہے یعنی حدیث مقسم ہے اور متواتر قسم ہے۔ ایسے نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص مقسم کو تسلیم نہ کرے اور قسم کو تسلیم کرے۔ کلمہ کو تسلیم نہ کرے مگر کلمہ کی ایک قسم اسم کو تسلیم کر لے یہ بات خلافِ عقل ہے پہلے مقسم کو (حدیث) تسلیم کرنا پڑے گا۔

اور جب ہم نے متواتر کو تسلیم کر لیا تو خبر واحد کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا اس لیے کہ تمام ادیان کی بنیاد ایک ہی آدمی یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتی ہے۔ تاریخِ عالم میں کبھی یہ نہیں ہوا کہ اللہ دس بیس کی تعداد میں انبیاء ایک ہی وقت میں مبعوث فرماتے ہوں لہٰذا خبر واحد کی حجیت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا اب جب مشہور و واحد حجت ہو گئی تو درمیان اقسام یعنی مشہور و عزیز خود بخود آ گئی۔[1]

---

[1] تفصیلات کیلئے دیکھئے: فضل الباری: ج ۱ ص: ۸۹، ۹۰۔

دلیل ۶: اصل میں حدیث کو شکوک و شبہات کی نگاہ سے اس لیے دیکھا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات میں کوئی مجموعہ حدیث تیار نہ ہوا تھا، اول تو ہم گذشتہ اوراق میں اس کی تردید کر چکے ہیں، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حدیث نہیں لکھی گئی ان تمام مجموعوں کا ذکر آچکا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ لکھے گئے، مزید برآں اگر اس دعویٰ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ حفظ کا دارومدار دو چیزوں پر ہوتا ہے۔

۱۔ قوت حافظہ۔

۲۔ تعلق و محبت۔

قوت حافظہ کے حوالہ سے صحابہ کرام کے چند واقعات ہم بیان کر چکے ہیں اب ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر تعلق تھا۔ ۶ھ میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثار صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ کے لیے جا رہے تھے، حدیبیہ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ کیا تو اہل مکہ نے مکہ میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ اہل مکہ نے نبی کریم سے علیہ وسلم سے بات چیت کرنے کے لیے عروۃ کو بھیجا۔ عروۃ نے صحابہ کرامؓ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شیفتگی، عشق اور والہانہ عقیدت و محبت کے مظاہرے دیکھے کہ جب کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے تھوک نکلتا ہے تو وہ زمین پر گرنے نہیں پاتا ہاتھوں ہاتھ اس کو لے لیتے اور اپنے چہروں پر مل لیتے ہیں، جب آپ وضو فرماتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسالہ وضو پر بھی لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ قریب ہے کہ آپس میں لڑائیوں کی نوبت آجائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم سے کوئی بال گرنے نہیں پاتا اس کو لے لیتے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کلام فرماتے ہیں تو ایک سناٹا ہو جاتا ہے۔ گویا کہ ہر شخص سر تا پا گوش بر آواز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے یہ مناظر دیکھنے کے بعد جب عروۃ واپس مکہ پہنچا تو اس نے اپنے تاثرات یوں بیان کیے۔

"اے قوم! واللہ میں نے قیصر و کسریٰ، اور نجاشی اور بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں مگر خدا کی قسم عقیدت و محبت، عظمت و اجلال کا یہ

عجیب وغریب منظر کہیں نہیں دیکھا" لہ

ایک روایت میں عروۃ نے یہ بھی کہا کہ یہ ساتھی جوان کا لعاب زمین پر گرنے نہیں دیتے ان کا خون زمین پر گرنا کس طرح برداشت کر سکتے ہیں۔

یہ ایک واقعہ اس اجتماعی عشق ومحبت اور عظمت کا بیان کیا جو صحابہ کرام کے دلوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جاگزیں تھی۔

جب صحابہ کرام کے عشق ومحبت کا یہ عالم تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غسالہ اور لعاب بھی ضائع نہ ہونے دیتے تھے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات سے کس طرح کسی غفلت کا برتاؤ کر سکتے تھے۔ آج کے منکرین حدیث سے تو وہ عروۃ جو اس وقت غیر مسلم تھے۔ زیادہ عقل و دانش کے مالک تھے کہ انہوں نے صحابہ کرام کے عشق کے مظاہروں سے درج بالا نتیجہ اخذ کیا لیکن آج کے منکرین حدیث ان باتوں اور ان تاریخی روایتوں کے ثبوت کے باوجود یہ گمان کر بیٹھے ہیں کہ صحابہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیمتی اقوال ضائع کر دیئے ہوں گے۔

دلیل ۷: آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ چونکہ صحابہؓ نے حدیث نہیں لکھی اس لیے حدیث حجت نہیں ہم اس سے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اگر صحابہ ایک حدیث بھی نہ لکھتے اور ایک حدیث بھی حفظ یاد نہ کرتے تب بھی حدیث کی حجیت متاثر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ صحابہ کرام کی زندگیاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اطاعت کا نمونہ اور عملی تصویر بنی ہوئی تھیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وپیروی ان صحابہ کرام کے لیے اپنی زندگیوں کا سب سے قیمتی متاع عزیز تھا۔ ۲ھ میں جب غزوۂ بدر کا معرکہ پیش آنے والا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو جمع کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ اس موقع پر حضرت مقداد بن اسودؓ نے ایک پر اثر تقریر کی۔

---

لہ کاندھلوی: م ا۔ سیرت المصطفےٰ: ج ۲ ص ۳۵۶

"أمضی لما امرك الله (تعالیٰ) فنحن معك والله لا نقول كما قالت بنواسرائیل لموسیٰ اذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون ولكن اذهب انت وربك فقاتلا انا معكما مقاتلون۔ ؎

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کا اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے، اس کو انجام دیجیئے، ہم سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم ہم بنی اسرائیل کی طرح ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ اے موسیٰ تم اور تمہارا رب جا کر لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں، ہم بنی اسرائیل کے خلاف یہ کہیں گے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار جہاد و قتال کرے، ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد و قتال کریں گے۔

حضرت ابوبکر صدیق کا منکرین زکوٰۃ کے خلاف اقدام کا ذکر گزر چکا وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کا ایک عظیم الشان نمونہ ہے۔

دلیل ۸ : اگر حدیث کو حجت نہ مانا جائے تو قرآن پر عمل ناممکن ہے۔ مثلاً قرآن کریم نے جابجا حکم دیا نماز کے قیام کا اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا، لیکن قرآن نے نماز یا زکوٰۃ کی ادائیگی کی تفصیلات نہیں بتائیں۔ اگر محض لغت کی رو سے اس کے معنیٰ تلاش کیے جائیں تو ان دونوں احکام پر عمل ناممکن و محال ہے۔

دلیل ۹ : منکرین حدیث کے انکارِ حدیث کی ایک بڑی علت اور پھر اس کی مدلل تردید گذر چکی، دوسری بنیادی علت یہ ہے کہ ان کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک رسول و قاصد کی سی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام محض اتنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ اللہ کا پیغام یعنی قرآن لوگوں کے سامنے تلاوت کر دیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا محض یہ فرض کہ وہ صرف قرآن کی تلاوت کی غرض سے آیا اور اس سے آگے اس کا منصب و مقام، کوئی فریضہ و ذمہ داری نہیں۔ اس بات کے ثبوت کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟ اگر قرآن سے کوئی دلیل ہے تو ھاتو برھانکم ان کنتم صادقین اور اگر قرآن سے نہیں تو دوسرا مرحلہ حدیث ہے اس کو آپ مانتے نہیں

---

؎ کاندھلوی، ص ۱۰ : سیرت المصطفیٰ : ج ۲ : ص ۶۲

تو لازماً تیسرا مرحلہ اجتہاد کا رہ جاتا ہے اور ایسا اجتہاد جو قرآن کی صریح آیات کے خلاف ہو ہرگز قابلِ قبول نہیں، اس کے برعکس اگر تعلیماتِ قرآنی پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ نبی کے فرائض تلاوت کے علاوہ اور بھی فرائض و ذمہ داریاں ہیں۔ ارشاد فرمایا:

لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم

یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ و

ان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ۔ [۱]

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں ایک رسول انہی میں سے بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے ان کو پاک کرتا ہے انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں تھے۔

اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ تلاوت کتاب کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض یہ تھے۔

۲۔ تزکیہ نفوس۔

۳۔ تعلیم کتاب و حکمت۔

اور ان فرائض کی انجام دہی اور بجالانے کا مقصد کیا تھا کہ اس تلاوت، تزکیہ اور تعلیم سے پہلے یہ لوگ صریح غلطی میں مبتلا تھے۔

اب سوچنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ کیا یہ مقصد یعنی لوگوں کو گمراہی سے نکالنا محض تلاوتِ کتاب سے حل ہو جاتا ہے کیا ان کو کتاب سمجھانے کی اس کے رموز، حکمتیں بتانے کی ضرورت نہ تھی؟ قرآن سے تو یہی ثابت ہوتا ہے اب اگر اپنے آپ کو اہل قرآن کہنے والوں کو یہ بات سمجھ میں نہ آئے تو اس میں ان کی عقل و فہم کا قصور ہے، قرآن میں کوئی کمی نہیں۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں۔

---

[۱] ۳۔ آل عمران۔ ۱۶۴۔

"جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، وہ اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف نامہ بر نہیں تھے، بلکہ خدا کی طرف سے رہبر، حاکم، اور معلم بھی تھے، جن کی پیروی و اطاعت مسلمانوں پر لازمی تھی" [۱]

دلیل نمبر ۱: تاریخی حقائق کو تسلیم کرنا ہر اہل عقل و دانش کے لیے ضروری ہے۔ خصوصاً جبکہ تاریخی حقائق کو مرتب کرنے میں اس کی سند و استناد میں بڑی اہمیت کا مظاہرہ کیا گیا ہو، کتبِ تاریخ میں منقول تاریخ سب لوگوں کے لیے حجت ہے اس کا انکار کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا تو پھر حدیث کے منکر کس طرح پیدا ہو گئے جبکہ حدیث نقل کرنے کے لیے محدثین کے جو معیار مقرر کئے گئے ہیں دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں پائے جاتے، لیکن اس کے باوجود دنیا کی تاریخ کو حجت و معتبر مانا جائے اور حدیث کو غیر معتبر۔

محدثین نے حدیث کو صحیح۔ غیر صحیح، موضوع اور غیر موضوع کے امتیاز کے لیے دو قسم کے معیار مقرر کیے ہیں:

۱۔ معیار برہانی: حدیث میں اگر مندرجہ ذیل امور میں سے کوئی امر پایا جائے تو وہ اس حدیث کے موضوع ہونے کی علامت ہے۔

الف: نصِ قرآنی کے مخالف ہو،

ب: سنتِ متواترہ کے خلاف ہو۔

ج: اجماعِ قطعی، یعنی اجماعِ صحابہ و تابعین کے خلاف ہو اور توجیہ و تاویل کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

د: عقلِ سلیم کے خلاف ہو، لیکن عقل کا سلیم ہونا شرط ہے۔

ہ۔ شریعت کے قواعد کلیہ اور مسلمہ امور کے خلاف ہو۔

و۔ سلسلہ سند میں کوئی ایک راوی بھی ایسا ہو کہ اس کے بارے میں مدت العمر میں ایک

---

[۱] مودودی، ابوالاعلیٰ۔ سید، سنت نبوی کی قانونی حیثیت، رسول نمبر، سیارہ ڈائجسٹ، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۵ء جلد ۲، صفحہ ۳۶۴۔

مرتبہ بھی جھوٹ ثابت ہو گیا ہو اس کی کوئی بھی روایت باجماع محدثین معتبر نہیں۔
راوی شیعی ہو، صحابہ کے مطاعن کے متعلق کوئی روایت کرے یا راوی خارجی ہو اور
اہل بیت کے مطاعن کے بارے میں کوئی روایت کرے۔
یہ معیار برہانی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اصل نہ پائی جائے تو روایت قابل قبول ہو گی
اس قدر سخت شرائط عائد کرنے کے بعد کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ غلط روایات منقول ہوں گی اور
پھر محدثین کرام نے بڑی مساعی، محنتوں اور جد و جہد کے بعد صحیح اور غیر صحیح کو ممتاز کر دیا موضوعات
کی الگ فہرست امت کو دے دی۔
اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا نہ یہ میرا موضوع اور نہ ہی اس کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت
حاجت ہے۔

دوسری قسم کا معیار۔

۲۔ معیار وجدانی، صحیح اور غیر صحیح کی معرفت کا معیار وجدانی یہ ہے کہ خداداد نور فہم نور فراست
نور تقویٰ اور معرفت سے، حدیث کے سنتے ہی یہ معلوم کر لے کہ یہ قول رسول صلی اللہ علیہ
وسلم ہے یا کسی اور کا قول ہے۔
محدثین کے نزدیک یہ معیار پہلے معیار کی تائید کرتا ہے یعنی اگر دونوں معیاروں میں کسی
فرد کے ہاں تناقض کی سی صورت پیدا ہو جائے تو معیار اول کو ترجیح حاصل ہو گی۔
ان دونوں معیاروں کے بعد تاریخ کو تسلیم کرنا اور حدیث سے انکار کرنا محض ضد و
عناد پر مبنی ہے عقل و دانش، فہم و دلیل اور علم و حکمت کا اس سے دور کا واسطہ و تعلق نہیں۔
فتلك عشرة كاملة
والله المستعان على ما تصفون۔